DUE DATE

Cl. No. ________ *Acc. No.* 12542б

Late Fine Ordinary Books **25 Paise** per day. Text Book **Re. 1**/- per day. Over Night Book **Re. 1**/- per day.

جامعہ

سالانہ قیمت
۹ روپے

اس شمارے کی قیمت
۶ روپے (علاوہ محصول)

جلد ۷۹ | بابت مارچ تا مئی ۱۹۸۲ء | شمارہ ۳-۵

فہرست مضامین

۱۔	شذرات	ضیاء الحسن فاروقی	۳
۲۔	میری طالب العلمی	مولانا محمد اسلم جیراجپوری مرحوم	۹
۳۔	مولانا اسلم مرحوم	پروفیسر محمد مجیب	۶۷
۴۔	مولانا اسلم میری نظر میں	مولانا عبد السلام قدوائی ندوی مرحوم	۷۱
۵۔	وہ مرد درویش ...	جناب غلام احمد پرویز	۷۸
۶۔	ایک عالم، ایک انسان	ڈاکٹر اطہر پرویز	۸۷
۷۔	یادوں کے چراغ	ڈاکٹر محمد معظم جیراجپوری	۹۴
۸۔	استاذ محترم مولانا محمد اسلم جیراجپوری	جناب معین الدین حارث	۱۰۸

عنوان	مصنف	صفحہ
۹۔ مولانا اسلم کی "تاریخ القرآن" — ایک جائزہ	پروفیسر مشیر الحق	۱۱۶
۱۰۔ "اسلم شیدائے طراز سخن"	ڈاکٹر شعیب اعظمی	۱۲۲
۱۱۔ مولانا اسلم جیراجپوری اور جامعہ ملیہ اسلامیہ	جناب سعید انصاری	۱۳۱
۱۲۔ مولانا اسلم کی اقبال شناسی	عبداللطیف اعظمی	۱۳۸
۱۳۔ مولانا اسلم بحیثیت استاد	جناب سید رئیس احمد جعفری مرحوم	۱۵۷
	پروفیسر مشیر الحق	۱۵۹
	ڈاکٹر محمد سالم قدوائی	۱۶۲
۱۴۔ مولانا اسلم کی کتابوں کی توضیحی ببلیوگرافی	عبداللطیف اعظمی	۱۶۵
۱۵۔ حیاتِ اسلم کی اہم تاریخیں	"	۱۷۳

مولانا کی چند نظمیں

عنوان	شاعر	صفحہ
۱۔ "جامعہ"	مولانا محمد اسلم جیراجپوری مرحوم	۶۴
۲۔ لامرکزیت	"	۶۷
۳۔ جذبۂ اخلاص	"	۱۹۳

شذرات

عرصہ سے خیال تھا کہ رسالہ جامعہ کا جس کے کئی برس تک وہ ایڈیٹر تھے ، ایک خاص نمبر مولانا اسلم جیراجپوری کی یاد میں نکالا جائے ، چند مضامین بھی جمع کر لئے گئے تھے اور اس خاص نمبر کا پورا خاکہ ذہن میں تھا ، لیکن ارادہ معرض التوا میں پڑتا رہا ، جنوری میں نئے سال ۱۹۸۲ء کا آغاز ہوا تو یہ طے کرلیا گیا کہ اب جبکہ مولانا ئے مرحوم کی پیدائش پر پورے سو سال بیت چکے ہیں ، زمانے کی رسم کے مطابق ان کی یاد میں جامعہ کا یہ خاص نمبر ضرور نکلے ۔ چنانچہ دو تین مہینے کی کاوش کا نتیجہ سامنے ہے ۔ اگرچہ ہم پوری طرح مطمئن نہیں ہیں لیکن اس کا اطمینان ضرور ہے کہ رسالہ جامعہ نے اپنے سابق مدیر کو بھلایا نہیں ہے ، اتنے کم عرصے میں جبکہ تقریباً تین چار ہفتے مجھے اور برادر عزیز جناب عبداللطیف اعظمی صاحب کو دہلی سے باہر رہنا پڑا ، جو کچھ بھی ہم سے بن پڑا ، مولانا ئے مرحوم کی یادوں کی دنیا میں لے کر حاضر ہیں ، اس میں مرحوم کی مذہبی ، علمی ، ادبی اور شخصی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مضامین ملیں گے ۔ ان کے بعض معتقدات و نظریات کی طرف واضح اشارے بھی ہوں گے اور ان کی منفرد شخصیت ، مزاج اور طبیعت کی جھلکیاں بھی ملیں گی ۔ سب کو یکجا کر کے دیکھئے تو ایک بڑی علمی و ادبی شخصیت جس میں سچی مذہبیت نے دلکشی اور جاذبیت کے کئی سحر آگیں رنگ بھر دئے تھے ، ابھر کر سامنے آئے گی ، اس لئے ہمیں امید ہے کہ ہمارے قارئین مایوس نہ ہوں گے ۔

مولانا اسلم جیراجپوری کے ساتھ مجھے کوئی دو برس کام کرنے کا موقع ملا ۔ اس وقت میرا قیام بھی ان کے مکان سے قریب ہی ایک کمرے میں تھا اور میں اکثر بعد نماز عصر ان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا ، اس طرح اس عرصے میں میں نے انھیں بہت قریب سے دیکھا اور ان کے علم اور ذہانت ، ان کی باریک بینی اور نازک خیالی ، ان کی روشن طبعی و خوش نفسی اور ان کی سادہ زندگی کی رعنائی نے طبیعت کو بہت متاثر کیا ۔ وہ ایک سچے مذہبی انسان تھے اور انھیں بچوں اور کمزور طبقے کے افراد سے ایک خاص

لگاؤ تھا، طبیعت میں خودداری بھی تھی اور مزاج میں ایک شانِ استغنا، جوان کی علمیت اور علمی بصیرت سے خوب میل کھاتی تھی، ۱۹۲۰ء کی قومی تحریک کے جلو میں علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم ہوئی تو جیسے اُن کی درویشانہ افتادِ طبع کو اعتماد و اطمینان کا مرکز مل گیا اور وہ ایم' اے، او کالج (علی گڑھ) کو چھوڑ کر جہاں وہ خوشحالی کی زندگی بسر کرتے تھے، باغبانیِ صحرا کا قانون قلمبند کرنے کے لئے ایک ایسی جگہ آ گئے جہاں عُسرت و بے سروسامانی تھی، یہ گویا پیدا کرنے والے سے ایک معاہدہ تھا کہ اس راہ میں "غمِ فرہاد" اور کوہ کنی کی مسرت جو "عشرتِ پرویز" سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہے، اُن کا توشۂ آخرت ہوگا۔ درحقیقت ۱۹۲۰ء کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب ہماری قومی و ملی زندگی ایک عرصہ کی "لذتِ کام و دہن" کی آزمائش سے گذر چکی تھی اور اس کی رگ و پے میں ایک دوسرے کا غم کا زہر اتر چکا تھا، یہ اب اس منزل پر تھی جہاں ہر لمحہ دار و رسن کی آزمائش تھی، یہ بات اہم ہے کہ مولانا اسلم نے اس منزل پر وطن اور ملت کا ساتھ نہیں چھوڑا اور اس وقت سے لے کر زندگی کے آخری لمحے تک وہ جامعہ کی خدمت میں لگے رہے، انھوں نے کوئی پینتیس ۳۵ برس تک ایک شاہانہ وقار کے ساتھ علم و ادب کی خدمت اور درس و تدریس کا کام کیا کہ بوریائے علم کے سامنے تخت و تاج بھی سر جھکاتے ہیں۔

علوم اسلامی اور عربی و فارسی زبان و ادب پر مولانا اسلم جیراجپوری کی نظر بڑی گہری تھی اور قرآن و قرآنی علوم کی تفہیم و تشریح تو ان کی تمام عمر کا علمی سرمایہ تھا، تاریخ اسلام کا مضمون بھی ان کی توجہ اور گہری دلچسپی کا موضوع تھا، تاریخ و سوانح پر ان کی تصنیفات اس امر کی شاہد ہیں کہ اگر مولانا نے خاص اسی شعبۂ علم کو اپنایا ہوتا تو بڑے مورخین اسلام کی صف میں انھیں ایک ممتاز مقام حاصل ہوتا۔ اس شمارے میں کئی مضمون ایسے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ قرآن فہمی اور قرآنی آیات میں تدبر و تفکر کا انھیں ایک خاص سلیقہ تھا اور اس سلسلے میں انھیں ایسا ملکہ حاصل تھا جسے ہم خدا کی دین ہی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ایک اور صفت ان کی یہ تھی کہ وہ شاعر بھی تھے اور ان کے فارسی اور اردو کے اشعار بہت اچھے ہیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاعری کو موانعِ کار میں سے سمجھتے تھے، اس لئے شاعری کا سلسلہ دور تک نہیں چلا۔ ان کے ادبی و تنقیدی مضامین ان کی ادبی

بصیرت، تنقیدی صلاحیت اور انشائی قابلیت کے بڑے اچھے ترجمان ہیں، ڈاکٹر اقبال مرحوم کی مثنوی اسرارِ خودی جب پہلی بار شائع ہوئی تو تصوف کی بحث میں حکیم افلاطون یونانی اور خواجہ حافظ شیرازی کے خیالات پر بعض حلقوں کی طرف سے احتجاج ہوا۔ جب بڑی گہما گہمی ہوئی اور مخالفین، و موافقین کی طرف سے بے معنی تحریروں کا ایک طومار بندھ گیا تو مولانا اسلم نے قلم اٹھایا اور اپنے خاص انداز میں اپنی متوازن رائے پیش کی۔ اس سلسلے میں انھوں نے "تصوف اور اسلام" پر بحث کرتے ہوئے جو کچھ لکھا تھا وہ نہ صرف ان کی انشاپردازی کا بلکہ اُن کی تاریخی بصیرت کا بھی ایک اچھا نمونہ ہے۔ اس میں انھوں نے توجہ دلائی تھی کہ

"۔۔۔ جب تاتاریوں کے حملے شروع ہوئے اور چنگیز اور ہلاکو نے ایک قیامتِ صغریٰ برپا کردی تو ان کی ہولناک خونریزیوں سے اُمّت کے فاتحانہ جذبات مٹ گئے۔ دنیا کی طرف سے ان کے دل سرد ہوگئے، طبیعتوں کا جوش اور ولولہ جاتا رہا، حوصلے پست اور ہمتیں شکست ہوگئیں، زوال وفنا کے نقشے آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ میلانِ خاطر زہد و ترک دنیا کی طرف بڑھ گیا اور سرمایۂ توکل و قناعت کو لے کر گوشۂ عافیت میں بیٹھنا پسند آیا۔ عالمِ فانی کے جاہ وجلال کی وقعت نگاہوں میں نہ رہی۔ بوریائے فقر سریرِ سلطنت سے زیادہ عزیز ہوگیا۔۔۔ ذوقِ عمل طبائع سے یہاں تک مسلوب ہوگیا کہ 'شیوۂ قلندری' کے مقابلے میں 'رہ ورسمِ پارسائی دور و دراز' نظر آنے لگی۔ عالمِ ذوق میں حلقۂ یاراں میں 'خلوت در انجمن' ہونے لگی اور سجادہ ہی پر 'سفر در وطن' کی کڑی منزلیں طے کی جانے لگیں۔۔۔۔ یہ اثرات اگر ایک ہی جماعت تک محدود ہوتے تو نقصان نہ ہوتا لیکن شاعری کے ساز پر یہ ترانہ کچھ اس انداز سے چھیڑا گیا کہ تمام ملک اس صدا سے گونج اٹھا اور ادبیاتِ اسلامیہ میں ایک قسم کے جمود اور رہبانیت کا اثر طاری ہوگیا۔"

مولانا اسلم جیراجپوری کے والد مولانا سلامت اللہ مرحوم کو نواب صدیق حسن خاں قنوجی نے بھوپال بلالیا تھا جہاں وہ صیغۂ تعلیمات میں کئی عہدوں پر فائز رہے۔ وہ مسلک اہلِ حدیث کے پیرو ہی نہیں بلکہ مبلغ بھی تھے، حنفی علماء سے ان کے قلمی مباحثے بھی ہوئے اور ان کے اثر سے بہت سے

لوگ مسلک اہلِ حدیث کے حامی بن گئے، مولانا اسلم بھی اسی مسلک کے پیرو تھے، لیکن بعد میں وہ ایک قدم اور آگے بڑھ گئے، یعنی یہ کہ جمہورِ امت کے برخلاف وہ "حدیث" کو وہ مرتبہ دینے کے لئے تیار نہیں تھے جو عام طور پر مستند سمجھا جاتا تھا اور مقبول تھا۔ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم نے اپنے مضمون میں اس سلسلے میں بڑی متوازن رائے دی ہے۔ مولانا اسلم مرحوم نے جو بحث چھیڑی تھی وہ طبقۂ علماء کے لئے ایک چیلنج تھی اور تھی بھی یہ بڑی نازک بحث، دونوں طرف دلائل بھی تھے اور براہین بھی، لیکن انھیں یہ جو "منکرِ حدیث" کہا گیا تو اس میں افراط و تفریط کا شائبہ ضرور تھا اور اسی کے ردِ عمل میں ان میں بھی ایک طرح کی ضد اور عصبیت پیدا ہوگئی جو ہمارے نزدیک علم و فکر کے حق میں مُضر ثابت ہوئی۔

مئی ۱۹۳۴ء کے معارف کے شمارے میں اُن کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا "حدیث دینی تاریخ ہے"۔ اس مضمون میں حدیث سے متعلق انھوں نے اپنے عقیدہ کی وضاحت ان الفاظ میں کی تھی:

"متواتر حدیثیں جو دو تین سے زائد نہیں ہیں اور وہ بوجہ اپنے تواتر کے یقینی کہی جاتی ہیں، اُن کو چھوڑ کر غیر متواتر حدیثیں میرے نزدیک ظنی ہیں، یعنی ان کا ثبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک یقینی نہیں ہے۔ بیشتر احادیث کا ذخیرہ جن کو محدثین نے صحیح قرار دیا ہے، اسی قسم میں داخل ہے اور جہاں تک مجھے علم ہے سوائے دو شخصوں یعنی ابن تیمیہ اور ابن صلاح کے جو صحیح بخاری کی حدیثوں کو یقین کا درجہ دیتے ہیں، بقیہ ائمہ نے سب کو ظنی ہی قرار دیا ہے اور تصریح کر دی ہے کہ وہ مفیدِ علم (یقین) نہیں ہیں۔ اگر کسی حدیث کی نسبت یہ یقین ہو جائے کہ وہ رسول اللہ کی زبانِ مبارک سے اسی طرح بیان ہوئی ہے تو اس کے بارے میں کوئی بحث ہی نہیں رہ جاتی۔

"ان احادیث مظنونہ کے متعلق میرا مسلک یہ ہے کہ ان کا تعلق قرآن کریم کے ساتھ قائم کرنا ضروری ہے۔ جو حدیثیں قرآن کے مطابق ہوں وہ مسلّم ہوں

اور جو مخالف ہوں وہ غیر مُسلّم ۔۔۔۔۔"

اس کے بعد مولانا نے لکھا تھا کہ حدیثیں چونکہ ظنّی ہیں، اس لئے اس کی قبولیت کی شرط یہ ہونی چاہیئے کہ وہ یقینیات کے مخالف نہ ہوں اور یقینیات میں وہ دو چیزوں کو شامل کرتے تھے، یعنی قرآن کریم اور عمل متواتر اور انھیں کو وہ نفس دین سمجھتے تھے۔ اور چونکہ "حدیثیں تاریخ دین ہیں" اس لئے ان کا "رد و قبول ان کی نفس دین کی مطابقت و مخالفت پر مبنی ہے۔" اسی بنیاد پر ان کا خیال تھا کہ قرآن کو قرآن ہی سے سمجھنا چاہیئے، روایت و احادیث سے قرآن کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔

ہمارا خیال ہے کہ اس غیر ضروری بحث کو چھیڑ کر مولانا نے معاصر علماء کے مقابلہ میں اپنا تفرد تو ثابت کیا، لیکن اس سے کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا۔ ایسی بحثیں پہلے بھی اٹھ چکی تھیں اور کیا مغرب اور کیا مشرق ہر جگہ بعض "اہل علم" نے احادیث کی کتب صحیحہ کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی تھی، درایت کے جو اصول ائمہ محققین نے وضع کئے ہیں وہ اتنے کافی وشافی ہیں کہ ان کی روشنی میں حدیثیں پرکھی جاسکتی ہیں اور اطمینان حاصل کیا جاسکتا ہے۔ پھر دنیائے اسلام کی مذہبی ثقافت کی تشکیل میں دوسرے عوامل سے قطع نظر، قرآن کے ساتھ حدیث کو بھی بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے اور انھیں دونوں بنیادی عناصر کے سہارے اس مذہبی ثقافت نے، ہر قسم کے سیاسی وسماجی دباؤ، ذہنی و علمی تفردات، متصوفانہ انحرافات اور نئی نئی قوموں اور نوع بنوع خیالات و تصورات کی یلغار کے باوجود، صدیوں پر پھیلے اپنے قابل رشک تسلسل کو مستحکم اور باقی رکھا ہے۔ مولانا نے جو مسئلہ اٹھایا تھا، وہ انھوں نے یقیناً پوری دیانت سے اٹھایا ہوگا، لیکن جیسا کہ ہوتا آیا ہے، ایسے نازک مسئلے ہمیشہ افراط و تفریط کی نذر ہو جاتے ہیں اور ایک نئے فرقے کی بنیاد پڑ جاتی ہے، مولانا نے مجھ سے خود یہ بات کہی کہ غلام احمد پرویز میرے خیالات کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں اور میرے ساتھ انصاف نہیں کرتے، وہ اپنے مسلک اہل قرآن کی سند حدیث سے متعلق میرے خیالات سے پیش کرتے ہیں جو صحیح نہیں ہے۔ میں نے مولانا سے بحث تو نہیں کی لیکن میں نے اپنے دل میں یہ ضرور کہا کہ تاریخ اسلام کے معلّم اور تاریخ الامت کے مصنف کو

یہ ضرور محسوس کرنا چاہئے تھا کہ حدیث سے متعلق اس کے نظریے سے اسلامی مذہبی ثقافت کے ایک کلیدی عنصر کی قدر و قیمت کتنی کم رہ جاتی ہے اور یہ کہ اس کے منفی نتائج کتنے دور رس ہو سکتے ہیں۔

بہرحال، مذہب، سیاست، معیشت و معاشرت، غرض زندگی کے ہر شعبہ میں مولانا کی طبیعت کورانہ تقلید اور جمود و تعطل سے اِبا کرتی تھی۔ وہ مُلائیت کے سخت مخالف تھے، جمہوریت کے شیدائی اور استبداد کے دشمن تھے اور کہتے تھے کہ "شوکتِ اسلام کے زوال کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ جمہوریت جو اسلام لے کر آیا تھا اور جس نے ہر مسلمان کو آزاد اور خود مختار بنا دیا تھا، مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتی رہی۔" مولانا اسلم نے علم و تدبر کو اپنا پیشوا بنایا تھا اور اس بات کو وہ پسند کرتے تھے کہ اُن کی تقلید بھی بے سوچے سمجھے نہ کی جائے، اُن کی علمی زندگی کا یہی طرّۂ امتیاز تھا اور یہی پیغام ہے جو وہ ہمیں دے گئے ہیں۔

مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری مرحوم

میری طالب العلمی

(مولانائے مرحوم نے یہ مضمون ۱۹۳۷ء میں لکھا تھا جو اُن کے مجموعۂ مضامین "نوادرات" میں شامل ہے، مرحوم نے اس میں تقریباً ہر جگہ سنہ ہجری لکھا ہے مگر افادۂ عام کی خاطر، بڑے بریکٹ میں سنہ عیسوی کا اضافہ کر دیا گیا ہے، نیز کہیں کہیں، حسب ضرورت، حاشیوں کا بھی اضافہ کیا گیا ہے اور مرحوم کے حاشیوں سے امتیاز کرنے کے لیے ان پر "ادارہ" لکھ دیا گیا ہے۔ تمام حاشیے مضمون کے آخر میں درج ہیں۔

مرحوم ۲۷ جنوری ۱۸۸۲ء (۷ ربیع الاول ۱۲۹۹ھ) کو جمعہ کے مبارک دن، اپنے وطن جیراجپور (ضلع اعظم گڈھ) میں پیدا ہوئے اور ۷۳ سال کی عمر میں، ۲۸ دسمبر ۱۹۵۵ء کو چہار شنبہ کے دن جامعہ نگر (دہلی) میں انتقال کیا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے عام قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے۔)

مجھے اپنی طالب العلمی کے حالات کو منظرِ عام پر لانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ صرف اس خیال سے ان کو لکھ رہا ہوں کہ میرا یہ زمانہ اسلامی ہند میں ایک عظیم الشان مذہبی تحریک یعنی اہلِ حدیث کے آخری دور کی یادگار ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ ان دھندلے سے نقوش سے جن کو میں تحریر میں لا رہا ہوں اس تحریک کے تاریخ نگار کو کچھ مدد مل سکے۔

ہندوستان میں ترکِ تقلید کا خیال حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات سے پیدا ہوا۔ وہ قرآن کریم پر غائر نظر رکھتے تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ یہ کتاب سرتا سر ذہنی غلامی

کے خلاف صدائے احتجاج ہے تو اہلِ علم کو تقلیدِ شخصی سے روکنے اور تحقیق کی طرف مائل کرنے کے لئے عملی کوشش شروع کی۔ کیونکہ اس ماحول میں جبکہ قرآن کے ترجمہ کرنے پر مسلمان تلواریں کھینچ کر ان کو قتل کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے تقلید کے خلاف کوئی عملی قدم اٹھانا سخت دشوار تھا۔

رفتہ رفتہ علماء میں سے کچھ لوگ ان کی باتوں کی طرف توجہ کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کے پوتے مولانا اسمٰعیل شہید علیہ الرحمہ کے زمانے میں، خالص کتاب وسنت کی حامل ایک جماعت تیار ہو گئی۔ ان لوگوں کے حوصلے بلند تھے اور انھوں نے پوری توجہ اعلاء کلمۃ الحق میں صرف کی۔

اس دور کے بعد جماعت کی بقا کے لئے علماءِ اہلِ حدیث نے علمی کوشش شروع کی جن میں شمس العلماء مولانا سید نذیر حسین عرف "میاں صاحب" خاص طور پر ممتاز ہیں۔ انھوں نے دلی میں حدیث کا درس دینا شروع کیا جو نصف صدی سے زیادہ تک مسلسل جاری رہا۔ اُن کے فیض سے ہندوستان میں ہزاروں علماءِ حدیث پھیل گئے۔ جنھوں نے گوشہ گوشہ میں کتاب وسنت کی اشاعت کی اور تقلید کو مٹایا۔ میاں صاحب کے آخری زمانے میں نواب صدیق حسن خاں نے بھوپال سے اس تحریک کی مالی اور علمی امداد کی جس سے اس کو عظیم الشان تقویت پہنچی۔

پہلے اس جماعت نے اپنا کوئی خاص نام نہیں رکھا تھا۔ مولانا شہید کے بعد جب مخالفوں نے ان کو بدنام کرنے کے لئے وہابی کہنا شروع کیا تو یہ اپنے آپ کو "محمدی" کہنے لگے، پھر اس کو چھوڑ کر اہلِ حدیث کا لقب اختیار کیا جو آج تک چلا جاتا ہے۔

الغرض ہندوستان میں غیر مقلدی کا آغاز شاہ ولی اللہؒ سے ہوا پھر مولانا شہیدؒ نے اس کی جماعت تیار کی جس کا امام سید احمد بریلوی کو بنایا۔ اس کے بعد صادق پوری علماء نے تبلیغی اور میاں صاحب نے علمی کوششوں سے اس کو مستحکم کیا اور فروغ دیا۔ اس کا آخری مرکز بھوپال تھا جہاں سے اس کی اشاعت کا کام سرگرمی کے ساتھ ہوا۔

نواب صدیق حسن خاں کی ذات اور نواب شاہجہاں بیگم کی علمی قدر دانی کی بدولت بھوپال اس زمانہ میں علماء و فضلاء کا مرکز تھا۔ نیز اقطاعِ ہند سے جو علماء مقلدوں کا مقابلہ اور کتاب و سنت کی اشاعت کرتے تھے ان میں سے اکثر بھوپال سے رابطہ رکھتے تھے اور بعضوں کو امداد بھی ملتی تھی۔ اس وجہ سے ہندوستان کے ہر حصہ سے اس جماعت کے اہلِ علم کی وہاں

آمد و رفت تھی۔ بلکہ نواب صاحب کی عربی تصانیف کی شہرت کی وجہ سے عراق، شام اور نجد وغیرہ کے علماء بھی کبھی کبھی وہاں آتے رہتے تھے۔

میرے والد مولانا سلامت اللہ مرحوم علماء بھوپال میں سلیقۂ گفتگو میں خصوصیت کے ساتھ ممتاز تھے اور عربی نہایت صاف اور بے تکلف بولتے تھے۔ اس وجہ سے ان وفود سے گفتگو کے لئے بیشتر وہی بلائے جاتے تھے۔

نواب صاحب کے انتقال کے بعد سے جو سنہ ۱۳۰۷ھ [۹۰-۱۸۸۹ء] میں ہوا بیرونِ ہند کے علماء کی آمد کا سلسلہ تو بہت کچھ بند ہو گیا تھا۔ لیکن ہندوستان کے اہلِ علم شاہجہاں بیگم کے عہد سنہ ۱۳۱۹ھ [۲-۱۹۰۱ء] تک آتے رہے کیونکہ امداد کا سلسلہ ان کی زندگی بھر جاری تھا۔

نواب صاحب کے بیٹوں کی زندگی امیرانہ تھی اور ان کے دروازوں پر پہرے تھے جہاں علماء کا گذر مشکل تھا اس لئے وہ لوگ اکثر والد ہی کے پاس ٹھہرتے تھے۔ والد اس زمانے میں ریاست کے محکمۂ تعلیمات کے مہتمم تھے اور واعظِ شہر۔ سرکار کی طرف سے ان کو رہنے کے لئے قدسیہ بیگم کا محل ملا ہوا تھا جو شہر کے معزز ترین حصے میں شیش محل اور موتی محل کے سامنے واقع ہے اور جس میں سینکڑوں آدمیوں کے رہنے کی گنجائش ہے۔ اس وجہ سے ہمارا گھر مقامی اور بیرونی علماء و اہلِ حدیث کا مرجع تھا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا، ان بزرگوں کی خدمت میں رہا اس وجہ سے مجھے ان کے حالات دیکھنے اور ان کے فیوض و برکات سے متمتع ہونے کے مواقع زیادہ نصیب ہوئے۔

بھوپال میں میری طالب العلمی کا زمانہ سنہ ۱۳۰۵ھ [۸۸-۱۸۸۷ء] سے شروع ہو کر سنہ ۱۳۱۹ھ [۲-۱۹۰۱ء] میں ختم ہو جاتا ہے۔ یہ شاہجہاں بیگم کی حکومت کا زریں عہد تھا جن کی دینداری، علمی قدردانی اور بے نظیر فیاضی کی بدولت شہر میں اسلامی شان اور خوشحالی نمایاں تھی اور علم و دین کا چرچا عام تھا۔ اس دراز مدت میں بہت سے علماء و فضلاء کو دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کا اتفاق ہوا۔ میں نے ان کو تحریر میں محفوظ نہیں رکھا۔ اب کہ ایک زمانہ گذر گیا ہے بہت تھوڑی باتیں میرے حافظہ میں باقی رہ گئی ہیں۔ ان میں سے بھی صرف انھیں کو لکھوں گا جن کا تعلق میرے تاثرات سے ہے۔ لیکن اس سے پہلے اپنی طالب العلمی کا حال نہایت اختصار کے ساتھ بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

آغاز

میری ولادت میرے وطن موضع جیراجپور ضلع اعظم گڈھ میں ۱۲۹۹ھ میں ۷ ربیع الاول [۲۷ جنوری ۱۸۸۲ء] یوم جمعہ کو ہوئی۔ اس وقت میرے والد حج کو گئے ہوئے تھے۔ حجاج کا یہ قافلہ ہمارے دیار میں اب تک مشہور ہے۔ اس میں علاوہ دیگر نامور بزرگوں کے آٹھ مشہور علمار اہلِ حدیث تھے جن میں مولانا حکیم عبداللہ صاحب جیراجپوری اور مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری بھی تھے، ان لوگوں نے علمار حرمین شریفین سے حدیث کی سندیں حاصل کیں، یہی وجہ ہوئی کہ واپسی میں دیر لگی۔

وطن واپس آنے کے بعد والد کو نواب صدیق حسن خاں نے بھوپال میں بلاکر مدرسہ وقفیہ کا صدر مدرس کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد وہ مدرسہ سلیمانیہ کے نائب مہتمم ہوگئے پھر جب مولوی محمد بشیر صاحب سہسوانی مہتمم مدرسہ مذکورہ کی تنخواہ مناصب میں منتقل ہوئی تو ان کی جگہ والد مدرسہ سلیمانیہ اور ریاست کے صیغۂ تعلیمات کے مہتمم ہوگئے۔ وہ ہر سال کنوار کی تعطیل میں ایک ماہ کے لئے وطن آیا کرتے تھے۔ جب میری عمر پانچ سال کی ہوئی تو مجھ کو مکتب میں بٹھا دیا۔

یہ مکتب خاص ہمارے دروازہ پر تھا، اس میں ایک میاں جی مولوی شکر اللہ نامی ہمارے خاندان کے بچوں کو پڑھاتے تھے، ایسے جلاد کہ اپنی نشست کے سامنے ہمیشہ ایک رسّی لٹکائے رکھتے جس میں قصور وار لڑکوں کے ہاتھوں کو باندھ کر ان کی پیٹھوں پر چھڑیاں توڑا کرتے۔ لڑکے جس قدر اُن سے ڈرتے تھے دنیا کی کسی اور چیز سے نہیں ڈرتے تھے۔ لیکن والد نے ان کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ میں اپنے بیٹے کو صرف مکتب میں بیٹھنے کی عادت ڈالنے کے لئے آپ کے سپرد کرتا ہوں، اس کے ساتھ سختی نہ کیجیے گا، چنانچہ انھوں نے مجھ پر کبھی سختی نہیں کی اور دہی برتاؤ رکھا جس کی والد نے ان کو ہدایت کی تھی۔ صبح کو جب میں مکتب میں جاتا تو مجھے سبق دیدیتے اور کہدیتے کہ جس وقت یاد کرکے سنا دوگے اس وقت چھٹی مل جائے گی، اس میں مجھے بڑی آسانی ہوئی۔ محنت کرکے تھوڑی دیر میں یاد کرلیتا اور سنا کر گھر چلا آتا۔ وہ اس قدر مہربان تھے کہ اگر کسی دن میرا جی پڑھنے کو نہ چاہتا تو چھٹی دیدیتے تھے۔ سال بھر میں قاعدہ اور تین پارے میں نے ختم کئے۔ دوسرے سال جب والد

تعطیل میں مکان پر آتے تو مجھ کو نہ میری والدہ کے بھوپال لے گئے۔

یہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ میرے ایک حقیقی پھوپھی زاد بھائی عبد الاعلیٰ تھے جن کے والدین انتقال کر گئے تھے۔ اگرچہ ان کے دادا اور چچا موجود تھے مگر والد نے ان کی کفالت اپنے ذمے لے لی تھی اور ان کو اپنے ساتھ ہی رکھتے تھے وہ سن میں مجھ سے دو سال بڑے تھے۔ جب میں بھوپال پہنچا ہوں وہ ڈھائی پارے حفظ کر چکے تھے۔ والد نے مجھے بھی حفظِ قرآن میں لگا دیا۔

حفظ قرآن

والد کے پیشکار سید مظہر حسین مرحوم بڑے متقی، باوضع اور جیّد حافظ تھے۔ ہم دونوں بھائی مدرسے میں جاکر اُن سے سبق لیتے تھے۔ مکان پر ایک دوسرے حافظ جو پنجاب کے رہنے والے تھے صبح اور شام کو سبق یاد کرانے اور آموختہ سننے کے لئے ملازم تھے، ان کا نام عبد الکریم تھا لیکن حافظ "مینو" کہے جاتے تھے۔ جس کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک دن تنہا بیٹھے ہوئے آنکھیں بند کرکے پنجابی میں ایک شعر گا رہے تھے جس کا پہلا مصرع یہ تھا:

مینو تینو کہن وہابی اِسوچ کی بُریائی

اسی دن سے اُن کا لقب مینو پڑ گیا اور سب اِسی نام سے اُن کو پکارنے لگے یہاں تک شہر کے لوگ بھی۔ وہ قرآن صحیح پڑھتے تھے اور قواعدِ قرارت سے واقفیت رکھتے تھے۔

والد نے ہمارے لئے مطبع نظامی کا چھپا ہوا کلام مجید منتخب کیا جس میں علاوہ اس کے کہ سوائے ایک نقطے کے اور کوئی غلطی نہیں ہے، یہ خوبی ہے کہ ایک پارہ کم و بیش چار ورق اور ایک رکوع نصف صفحہ میں تمام ہوتا ہے جس کا یاد کر لینا طبیعت پر بار نہیں گزرتا۔ ہم ہر مہینے میں آسانی سے ڈیڑھ بلکہ دو پارے تک حفظ کر لیتے تھے، روزانہ پڑھائی کے صرف تین گھنٹے تھے باقی دن بھر آزادی۔

عبد الاعلیٰ کو والد نے اپنا بیٹا بنا لیا تھا اور مجھ کو والدہ نے۔ ہم دونوں میں مقابلہ رہتا تھا۔ سبق ہمارے مختلف منزلوں سے ہوتے تھے۔ باوجودیکہ وہ ڈھائی پارے مجھ سے پہلے حفظ کر چکے تھے، میرے ختم قرآن کے دن اُن کے چار پارے باقی تھے۔

مجھے ۲۴ مہینے یعنی دو سال پورا قرآن حفظ کرنے میں لگے جن میں سے تقریباً تین مہینے

بیماری میں گذرے۔

یہ بیماری تپ محرقہ کی تھی۔ حکیم بھی تھے اور ڈاکٹر بھی مگر کسی کی دوا سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ سر کے بال جھڑ گئے اور کبھی کبھی غفلت کا غلبہ ہونے لگا۔ ایک دن سرِ شام ہی سے بالکل بےہوش ہو جاتا رہا اور آنکھیں بند ہو گئیں۔ رات بھر والدہ میرے سرہانے بیٹھی رہیں اور والد اضطراب میں چارپائی کے سامنے صحن میں ٹہلتے رہے۔ پریشانی کی وجہ سے گھر میں کھانا بھی نہیں پکا۔ فجر کے وقت جبکہ والد مسجد میں جماعت پڑھانے گئے تھے میں ایک دم اُٹھ بیٹھا اور لوٹے میں پانی مانگا۔ والدہ نل میں سے لوٹا بھر رہی تھیں کہ سیڑھیوں پر والد کے آنے کی آہٹ معلوم ہوئی۔ لپک کر گئیں اور کہا کہ لڑکا اٹھ بیٹھا۔ والد اُلٹے پاؤں مسجد کو لوٹ گئے اور مقتدیوں کو جن کے ساتھ مل کر میری صحت کی دعا مانگی تھی یہ خبر سنائی۔ پھر گھر میں آئے۔ میں ہشاش بشاش تھا اور مرض سے نجات پا چکا تھا۔

میرا ننھیال خاندان ہی میں ہے۔ بچپن سے مجھ کو میری نانی اور نانا نے پرورش کیا تھا۔ اس وجہ سے میں والدین سے زیادہ مانوس نہ تھا اور ننھیال آنے پر اُن کو کبھی کبھی تنگ کیا کرتا تھا۔ والدہ نے مجھ سے کئی بار کہا تھا کہ دیکھو ایسی کوئی بات نہ کرنا جس سے تمہارے حق میں تمہارے ابا کی زبان سے کوئی بُرا کلمہ نکل جائے۔ کیونکہ اللہ اُن کی بات سنتا ہے۔ میں نے کہا کہ کیا ہماری بات نہیں سنتا؟ کہنے لگیں کہ سنتا تو سب کی ہے مگر ان کی جلد مان لیتا ہے جو اس کے ولی ہوتے ہیں۔ غالباً ٹھیک وہی وقت تھا جبکہ والد اُدھر نماز کے بعد دعا مانگ رہے تھے کہ اِدھر اللہ نے مجھ کو دوبارہ زندہ کر دیا اس لئے مجھ کو والدہ کی بات کا یقین آ گیا۔

والدہ نے میرے صحت یاب ہونے پر اپنے زیوروں کو خیرات کر دینے کی منت مانی تھی۔ صبح کو ان سب کی ایک پوٹلی باندھ کر والد کے حوالے کر دی۔ انھوں نے اس کو طلبا کے مصرف کے لئے ابراہیم پورہ کی مسجد میں بھیجدیا۔ والدہ نے اس کے بعد سے پھر کبھی چاندی کا ایک چھلا بھی نہیں پہنا۔

یہاں بطور تحدیثِ نعمتِ الٰہی کے یہ بیان کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ اس بیماری کے بعد سے آج تک کہ تقریباً پچاس سال ہو گئے اور مجھے ہمیشہ وطن سے باہر غربت ہی میں رہنا پڑا کبھی کسی سخت بیماری میں اللہ نے مبتلا نہیں کیا۔ اتفاقیہ طور پر اگر کبھی کوئی معمولی شکایت ہو جاتی ہے تو دوا کرتا ہوں مگر فوراً اطلاعی خط والدہ کو لکھ دیتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ کس دن ڈاکیہ میرے گاؤں

میں جاتا ہے اُسی دن شفاء کی اُمید رکھتا ہوں ۔ کیونکہ جہاں خط پہنچا ، والدہ دونوں ہاتھ اٹھا کر اللہ کے سامنے کھڑی ہوگئیں اور ادھر میں اچھا ہوا ۔

حفظِ قرآن کے بعد رمضان شریف میں صرف چند مہینے رہ گئے تھے اور مجھے اس سال قرآن سُنانا تھا اس وجہ سے روزانہ دس دس پارے حافظ جی کو سنانے شروع کر دیئے اور خوب رواں کر لیا ۔ بالآخر شوال ۱۳۰۶ھ [۱۸۸۹ء - ۹۰] میں جبکہ میری عمر کا نواں سال تھا میں نے پہلی محراب سنائی ۔ روزانہ ایک پارہ آٹھ رکعتوں میں پڑھتا تھا لیکن دن بھر اس کو رٹتا تھا اور شام کو حافظ جی کو سُنا لیتا تھا ۔ میری قرارت قواعد کے مطابق اور صاف تھی کہیں بھولتا نہ تھا ۔ آواز بھی اس وقت اچھی تھی اس وجہ سے لوگ پسند کرتے تھے اور اہلِ حدیث دور دراز محلّوں سے سننے کے لئے آتے تھے ۔ شبِ قدر کے خیال سے ستائیسویں رات ختم کے لئے متعین ہوئی ۔ اس دن مسجد آراستہ کی گئی ۔ والدہ نے دن بھر مٹھائی تیار کرائی اور سرکار کی طرف سے چھ بورے بتاشے آئے اور کچھ روپے بھی جو اُن حافظ صاحب کو دیئے گئے جنھوں نے میرے پیچھے کھڑے ہو کر قرآن سُنا تھا ۔

اس دن والدین کی خوشی دیکھ کر مجھے اپنا گھر خوشی سے معمور نظر آتا تھا اور اس خیال سے اس میں اور بھی زیادتی ہوتی تھی کہ یہ میری بدولت حاصل ہوئی ہے ۔ شام کے وقت والدہ نے مجھے وہ کرتا اور پاجامہ پہنایا جس کو خود اپنے ہاتھ سے سی کر تیار کیا تھا ، اب تک مجھ کو اس کرتے کا رنگ اور بوٹے یاد ہیں ۔ اس وقت مجھ میں عقل نہیں تھی ورنہ اس کو پیراہنِ یوسف کی طرح زندگی بھر کے لئے محفوظ کر لیتا ۔ دوسرے دن صبح کو والد نے ایک نہایت قیمتی زرّیں دوشالہ جو اُن کو اُسی سال سرکار سے خلعت میں ملا تھا نکالا اور اس پر سو روپے رکھ کر مجھے حکم دیا کہ اپنے استاد حافظ سید مظہر حسین کے سامنے لے جا کر پیش کر دو ، [نیز] ایک آدمی کے سر پر مٹھائی کا ٹوکرا رکھ کر ساتھ کر دیا ۔ حافظ صاحب موصوف نے خوش ہو کر اپنا متبرک ہاتھ میرے سر پر پھیرا اور مجھے دعائیں دیں جن کا اثر بحمد اللہ آج تک میں دیکھ رہا ہوں ۔

فارسی

حفظِ قرآن کے بعد روزانہ صبح کو ایک منزل سنانے کا سلسلہ سالہا سال تک جاری رہا ۔ اسی

کے ساتھ فارسی کے چھوٹے چھوٹے رسائل جو اس زمانے میں عام طور پر پڑھائے جاتے تھے ہم نے گھر ہی میں پڑھے۔ حفظِ قرآن کی بدولت محنت کی عادت پڑ گئی تھی اور حافظہ قوی ہوگیا تھا، جو کچھ پڑھتے تھے چند بار دہرانے سے ازبر ہو جاتا تھا، یہاں تک کہ گلستاں اور بوستاں دونوں کتابیں پوری پوری یاد کر ڈالیں۔ ہر جمعرات کو اُن کے ایک ایک باب کا آموختہ کھڑے ہو کر زبانی سنایا کرتے تھے۔ قواعد کی مشق لکھا کر کرائی گئی۔ چنانچہ اس نوشتہ کو "قواعدِ اسلمیہ" کے نام سے میں نے اسی زمانے میں سرکاری مطبع میں طبع کرا دیا تھا ایک جزو کا مختصر رسالہ سلیس فارسی زبان میں ہے۔ اس کے بعد مولانا احسن صاحب شاعؔر کے دو رسالے پنج سبق اور دہ سبق مع تحریری مشق کے پڑھے جن سے صحیح فارسی لکھنے کا ڈھنگ آگیا۔ فارسی کی دیگر درسی کتب کی تعلیم والد نے مولوی فتح اللہ صاحب کے سپرد کر دی۔

مولوی صاحب موصوف نے ایک دن ظلمات اور آبِ حیات کے قصے میں فرمایا کہ اس کی حقیقت بھی کچھ سمجھے؟ ظلمات سے مراد سیاہ حروف ہیں اور آبِ حیات سے معانی۔ جو شخص عبارت سے مطلب نکال لیتا ہے وہ گویا خضر ہے کہ ظلمات میں سے آبِ حیات لاتا ہے، اور یہ قدرت صرف مطالعے کی قوت بڑھانے سے حاصل ہوتی ہے اور جو شخص ہر قدم پر استاد کا محتاج ہے وہ اس سے محروم رہتا ہے، جیسے سکندر کہ خضر کی رہنمائی سے بھی آبِ حیواں اس کو نصیب نہ ہو سکا۔ یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی۔ اسی دن سے میں نے آئندہ سبق کا مطالعہ لازم سمجھ لیا جس کی بدولت ہر کتاب آسان ہوگئی اور فارسی کا درسی نصاب جلد ختم کر لیا۔ اس کے ساتھ بہت سی بالائی کتابیں مثلاً شاہنامہ فردوسی و دواوین اساتذہ، مثنویاں وغیرہ خود اپنے شوق سے دیکھ ڈالیں۔

اس زمانے میں بھوپال میں فارسی کا چرچا عام تھا۔ میں اس میں شعر بھی کہنے لگا تھا مگر والد کو جب معلوم ہوا تو انھوں نے تضیع اوقات کے خیال سے منع کر دیا۔ فارسی کا کل مرحلہ چار سال کے اندر ہی ختم ہوگیا اسی کے ساتھ ساتھ ریاضی بھی۔

ریاضی

حساب، اقلیدس، مساحت اور جبر و مقابلہ پڑھانے کے لئے مولوی شاہ محمد صاحب جو بھوپال کے مشہور ریاضی داں تھے، مقرر ہوئے۔ روزانہ ہمارے گھر آکر تعلیم دیتے تھے۔ ایک دن

انھوں نے امتحان لیا۔ کسر ملتف کا سوال تھا۔ سب سے پہلے اس کا جواب میں نے دیا۔ انھوں نے سلیٹ کو دیکھا اور اُلٹ کر رکھدیا۔ اس کے بعد میرے اور ساتھیوں نے اپنی اپنی سلیٹیں دیں۔ وہ ان کو اسی ترتیب سے ایک دوسرے پر رکھتے گئے۔ جب سب کے جوابات آگئے تو غالباً اس وجہ سے کہ پہلی نظر میں ان کو میرا جواب غلط معلوم ہوا تھا بے ساختہ ایک طمانچہ مجھ کو مار دیا۔ میری زندگی میں یہ بالکل نیا اور غیر متوقع واقعہ تھا اس لئے میں مضطرب ہو گیا اور میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے مگر خاموش بیٹھا رہا۔ جب انھوں نے اطمینان سے جوابات دیکھے تو کسی کا عمل غلط تھا اور کسی کا جواب، لیکن میرا جواب اور عمل دونوں ٹھیک نکلے۔ میں نے پوچھا کیا غلطی ہوئی ؟ کچھ نہیں بولے۔ میں اُٹھ کر سیدھا اپنے کمرہ میں چلا آیا اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ مجھے سخت رنج تھا۔ کیونکہ میں ہر استاد کی عظمت کا لحاظ رکھتا تھا اور اس کے ہر حکم پر اُس کی منشا کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ کبھی کسی استاد کو ناراض ہونے کا موقعہ نہیں دیا اور ان کی طرف سے بھی سوائے شفقت اور محبت کے کوئی دوسری بات نہیں دیکھی، اس لئے اس واقعہ سے نہ صرف میری عزتِ نفس بلکہ اس اعتماد کو بھی صدمہ پہنچا جو میں اپنے استادوں پر رکھتا تھا اگرچہ تسلی کے لئے یہ بات کافی تھی کہ استاد اور ساتھیوں دونوں پر ظاہر ہو گیا تھا کہ میں بے قصور ہوں مگر پھر بھی قلق تھا کہ یہ بات ہی کیوں پیش آئی۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس کے بعد واقعہ کی رفتار کیا ہوئی مگر پھر مولوی صاحب موصوف ہم کو پڑھانے کے لئے نہیں آئے بلکہ ان کی جگہ مولوی محمد اکبر خاں صاحب جو مدرسہ جہانگیری میں ریاضی کے مدرس تھے آنے لگے۔

میرے نزدیک استاد اور شاگرد کا تعلق دماغی ہے، یہ نہ بیٹے اور باپ کا سا رشتہ ہے نہ بھائی اور بھائی کا سا۔ بلکہ افادہ اور استفادہ اور خوردی اور بزرگی کا ایک مصاحبانہ مگر مقدس تعلق ہے جس کا احترام شاگرد سے زیادہ خود استاد پر لازم ہے کیونکہ استاد کی ذرا سی بھی غلطی سے شاگرد کو بہت نقصان پہنچ جاتا ہے، بخلاف اس کے شاگرد کی غلطی استاد کے لئے زیادہ خطرناک نہیں ہے۔

ریاضی ختم کرنے کے بعد ایک ماسٹر صاحب مجھے انگریزی پڑھانے کے لئے اسی وقت میں آنے لگے۔

صرف ونحو

ان کی تعلیم میں کتابوں کی بجائے اصل فن کے سکھانے پر نظر رکھی گئی۔ طریقہ یہ تھا کہ مولوی

فتح اللہ صاحب دن کو سبق پڑھاتے اور شام کو بعد مغرب ہمارے یہاں آجاتے۔ ان کے مواجہہ میں والد مجھے حکم دیتے کہ جو کچھ تم نے پڑھا ہے بیان کرو۔ میں روزانہ اپنے ہر ایک سبق کی صاف اور سلجھی ہوئی تقریر تیار کر رکھتا تھا۔ کھڑے ہو کر سنا دیتا۔ اگر کوئی اعتراض ہوتا تو اس کا بھی جواب دیتا۔ ہر مہینے کے آخر میں اس مہینہ کی پوری پڑھائی اپنی عبارت میں لکھ کر پیش کرنی پڑتی تھی۔ یہ سلسلہ فصول اکبری اور کافیہ تک رہا جو برزبان یاد کرائی گئی تھیں۔ بھوپال میں اس وقت صرف و نحو کے اچھے اچھے استاد تھے۔ جب اُن میں سے کوئی ہمارے یہاں آتا تو امتحان لیتا۔ میرے ساتھی اس کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن مجھے خوشی ہوتی تھی کیونکہ میں ہر سوال کا جواب دینے کو تیار تھا۔

جب شرح جامی شروع ہوئی تو میرے ساتھیوں کی تعداد ۱۲ تک پہنچ گئی۔ میں اپنا سبق مطالعہ کر کے ایسا تیار کر لیتا تھا کہ استاد سے کسی بات کے سمجھنے یا پوچھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی تھی۔ اُن کو یہ بات معلوم تھی اس وجہ سے سبق کے وقت تقریر مجھ سے ہی کراتے تھے۔ تکرار میں میں اطمینان کے ساتھ اپنے ساتھیوں کو سمجھاتا تھا۔ ان میں ایک شخص مولوی عبدالصمد صاحب سرحد کے رہنے والے تھے جن کی عمر تیس سال سے کم نہ تھی۔ وہ بار ہا شرح جامی مختلف مدرسوں میں پڑھ چکے تھے بلکہ انھوں نے خود کافیہ کی ایک شرح فارسی میں لکھی تھی۔ تحریر سنبٹ ان کو مستحضر تھی اس کے اعتراضات کرتے تھے۔ مگر وہ کتاب میرے پاس بھی تھی اس لئے میں جوابوں کے واسطے تیار ہو کر آتا تھا۔

فقہ و اصول

مولوی فتح اللہ صاحب جس طرح صرف و نحو میں اچھے استاد سمجھے جاتے تھے اسی طرح فقہ و اصول میں بھی ان کی شہرت تھی۔ والد نے ان علوم کی تعلیم بھی انھیں کے سپرد کی۔ اہل حدیث کے نزدیک فقہ کی دینی اہمیت نہیں ہے، اس کی تعلیم محض اتمام نصاب کے لئے دی جاتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے اکثر مسائل سے ہماری روح بغاوت کرتی تھی۔ ایک بار قاضی شیخ محمد صاحب جعفری نے مجھ سے پوچھا کہ تم کیا پڑھ رہے ہو؟ میں نے کہا کہ شرح وقایہ پھر پوچھا کہ حدیث کی بھی کوئی کتاب پڑھی ہے یا نہیں؟ میں نے کہا کہ نہیں۔ کہنے لگے کہ تمہارے والد بہت دانشمند ہیں۔ وہ پہلے تاریکی کی سیر کراتے ہیں تاکہ روشنی کی قدر معلوم ہوسکے۔

اصول فقہ قیاسی علم ہے جس سے مجھ کو دلچسپی ہو سکتی تھی مگر نصاب میں جو کتابیں ہیں ان کا علمی پہلو نہایت حقیر ہے۔ والد نے جب شکایت سنی تو غزالیؒ کی "المستصفیٰ" کے مطالعے کا مشورہ دیا۔

سراجی میں جب حجب کا مسئلہ آیا اور معلوم ہوا کہ حافظ عبدالاعلیٰ محجوب الارث ہیں تو اُن سے زیادہ مجھ کو قلق ہوا۔ میرا دل مطلقاً قبول نہیں کرسکا کہ یہ اسلام کی تعلیم ہو سکتی ہے کہ یتیم پوتا جملہ خاندانی ملکیت سے محروم کر کے گھر سے خارج کر دیا جائے۔ لیکن جس قدر اس کی تحقیق کی اسی قدر اس پر نہ صرف مذاہب اربعہ بلکہ جملہ ائمہ حدیث وعلماءِ سلف کو متفق پایا اور ساری اسلامی تاریخ میں ایک شخص بھی ایسا نہ ملا جس نے اس کی مخالفت کی ہو۔ مگر دل میں یہ خلش برابر رہی۔ الحمدللہ کہ قرآنِ کریم نے رہنمائی کی اور سورج کی طرح واضح کر دیا کہ یہ مسئلہ صحیح نہیں ہے۔ آخر میں خواجہ احمدالدین صاحبؒ امرتسری کے رسائل سے جو انھوں نے اس مسئلے پر لکھے تھے، مجھے مزید دلائل مل گئے۔ میں نے سالہا سال تک بہت سے اہلِ علم سے زبانی گفتگو کی اور جو اہلِ فتویٰ ہیں اُن سے تحریری مناظرے کیے۔ مگر کسی کے پاس میری دلیلوں کے جواب نہ نکلے۔ اس وقت رسالہ محجوب الارث لکھ کر شائع کیا۔ جس میں ثابت کیا کہ قرآن اور حدیث تو خیر خود فقہ کی رو سے بھی یتیم اولاد محجوب نہیں ہو سکتی۔

اس مسئلہ کے علاوہ میراث کی تدوین میں بنیادی غلطیاں ہو گئی ہیں جن کو خواجہ احمدالدین صاحبؒ نے اپنے رسالہ معجزۂ قرآن میں تفصیل کے ساتھ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ میں نے ان کو علمی شکل میں ترتیب دے کر عربی زبان میں "الوراثۃ فی الاسلام" کے نام سے شائع کیا۔

منطق و فلسفہ

والد نے خود صغریٰ وکبریٰ وغیرہ پڑھا کر منطق کے اصول ذہن نشین کرائے۔ پھر تہذیب زبانی یاد کرائی۔ اس کے بعد شرح تہذیب اور ہدایت الحکمۃ ساتھ ساتھ پڑھائی۔ روزانہ دو سبق فقہ اور اصول کے مولوی فتح اللہ صاحب کے یہاں ہوتے تھے اور دو سبق منطق و فلسفہ کے والد کے یہاں۔ مطولات میں پہنچ کر صرف تین سبق روزانہ رہ گئے۔ جن کو والد خود ہی پڑھاتے تھے۔ صدرا اور شمس بازغہ تک یہی سلسلہ رہا۔ ہیئت میں تصریح اور شرح چغمنی بھی والد ہی نے پڑھائی۔

ادب

والد نے پہلے زمخشری کی اطواق الذہب حفظ کرائی۔ پھر نفحۃ الیمن پڑھائی۔ ہمارے مکان سے ملا ہوا مکان مولانا عباس کا تھا جو صاحب نفحۃ الیمن احمد شروانی یمنی کے بیٹے تھے۔ میرا خیال تھا کہ باپ کی تصنیف بیٹے سے پڑھوں۔ لیکن والد کو ان کی عربیت پر اعتماد نہ تھا۔

صحابہ کرام کے رجزیہ و بعض دیگر اشعار کا ایک مختصر مجموعہ والد نے تیار کیا تھا، اس کو ہم سب نے نقل کر لیا اور سبقاً سبقاً پڑھ کر یاد کیا، پھر مقامات زمخشری پڑھی اور سبعہ معلقہ ازبر کیا۔ حریری اور ہمدانی کے مقامات اور دیوان متنبی و حماسہ کے انتخابات تقریباً نصف نصف جو خود والد نے کر دیئے تھے، پڑھے۔

حکیم معز الدین خاں صاحب سابق افسر الاطباء بھوپال نے مطول کو محشی کر کے نہایت خوبی کے ساتھ چھپوا دیا تھا۔ جس زمانے میں اس کتاب کو میں شروع کرنے والا تھا انھوں نے ایک نسخہ والد کے لئے اور ایک نسخہ خاص میرے لئے بھیج دیا، اس وقت خوشی اور ممنونیت کا جو جذبہ میرے دل میں پیدا ہوا تھا آج تک یاد ہے۔

ادب کی تعلیم عربی زبان ہی میں دی جاتی تھی اور ہر ہفتے میں ایک قصہ عربی میں ترجمہ کرایا جاتا تھا۔ مطالعہ کے لئے واقدی کی فتوح الشام اور الف لیلہ کی جلدیں ملیں جن کو میں نے چند ہفتوں میں ختم کر ڈالا پھر محاضرات اور تراجم ادبا کی کتابیں دیکھنی شروع کیں۔

حدیث

سب سے پہلے شیخ محمد بن عبد الوہاب نجدی کے رسائل کا مجموعہ جو دہلی سے شائع ہوا تھا اور جس میں کتاب التوحید اور کتاب الایمان وغیرہ ہیں، سبقاً سبقاً پڑھایا گیا، اس کے بعد بلوغ المرام اور موطا امام مالکؒ۔ اصول حدیث میں نخبہ و دیگر رسائل سے جملہ اقسام حدیث اور اس کے علل کے شجرے لکھا کر یاد کرائے گئے، آخر میں صحیح بخاری پڑھائی گئی پھر صحیح مسلم۔

میرا خیال تھا کہ کوئی ایک کتاب شیخ حسین عرب سے بھی پڑھ لیتے جو اس وقت حدیث کے جگت استاد تھے، مگر والد سند کے زیادہ قائل نہیں تھے وہ لیاقت پیدا کرانی چاہتے تھے۔

قرآن

والد نے کہا کہ میں قرآن پڑھاؤں گا۔ تم میں سے ہر ایک اپنے لئے ایک ایک الگ تفسیر منتخب کر لے اور سبق اسی سے تیار کر کے لائے۔ میں تفسیر کبیر چاہتا تھا مگر اس کو میرے عزیز ترین ہم سبق توقیر الحسن نے چن لیا۔ کشاف کو عبدالغفور نے لیا۔ میں نے اپنے واسطے شیخ علی مہائی تبصیر الرحمٰن رکھی جس میں آیات کا ربط دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اوروں میں سے کسی نے ابن کثیر کو لیا کسی نے بیضاوی کو کسی نے جامع البیان کو کسی نے جلالین کو۔ والد کے سامنے معالم التنزیل رہتی تھی۔ میں اس کا بھی ایک نسخہ اپنے مطالعے میں رکھتا تھا۔

یہ سبق روزانہ ظہر کے بعد کم و بیش دو گھنٹے میں ہوتا تھا۔ ہر آیت بلکہ ہر لفظ کے متعلق تفسیری مباحث مختلف پہلوؤں سے درمیان میں آتے تھے۔

درسی نصاب

جو علوم ہم کو پڑھائے جاتے تھے ان کی غرض و غایت فنی حیثیت سے اگرچہ بیان کر دی جاتی تھی مگر ہماری نگاہ میں صرف یہ بات تھی کہ جاننے والے معزز اور مولانا سمجھے جاتے ہیں، اس لئے ان کا جاننا ہی بجائے خود انسانیت کے لئے شرف ہے۔ اس وقت کسی درسی علم کے ضروری یا غیر ضروری یا مفید یا غیر مفید ہونے کا کوئی خیال ہمارے ذہنوں میں نہ تھا۔ لیکن دو باتیں بالخصوص میری نگاہ میں اس وقت بھی کھٹکتی تھیں۔ ایک تو یہ کہ حدیث کے سوا باقی علوم میں خواہ عقلی ہوں یا نقلی جو کتابیں رکھی گئی ہیں، وہ تقریباً تمام کی تمام شرحیں ہیں جن میں نہ صرف غیر ضروری بلکہ غیر متعلق اور لاطائل بحثیں بھری ہوئی ہیں۔ میں سوچتا تھا کہ خود متون مثلاً شمسیہ، سلم العلوم، مسلم الثبوت اور وقایہ وغیرہ کیوں نہیں پڑھائے جاتے اور ان شروح کی تعلیم میں کیوں فضول وقت ضائع کیا جاتا ہے۔ مگر جب ان متون پر غور کیا تو اس قدر مغلق نظر آئے کہ پڑھانے کے قابل نہیں معلوم ہوئے کیونکہ ان کے مصنفوں کے نزدیک بڑا کمال یہ تھا کہ کم سے کم الفاظ میں مسائل کی طرف اجمالی اشارات کر دیئے جائیں، خواہ وہ معما ہی کیوں نہ بن جائیں۔ شروح اور متون کی ان خرابیوں کے متعلق اسی زمانے میں میں نے ایک طالب العلمانہ غزل بھی لکھی تھی جس کے چند شعر یہ ہیں:

چیستاں سُلّم، مسلّم سربسر ابہام ہے　　کچھ عبارت سے نہ حلِ عقدۂ باطن ہوا

ہو سکے شرحوں سے شرحِ صدر کی امید کیا　　شارحوں میں بحثِ لفظی کا مرض مزمن ہوا

ایک کا اجمال مہمل، ایک کی تفصیل لغو　　علم تھا جتنا وہ نذرِ شارح و ماتن ہوا

بیشک ان سب میں سراجی ایسی ہے جس کو متنِ متین کہا جا سکتا ہے۔ اس کے مصنف نے نہ معلوم کس دقتِ نظر کے ساتھ اس کو لکھا ہے کہ بے کم و کاست پورا فن اس سے حل ہو جاتا ہے۔ ساری کتاب میں اگر کہیں ایک لفظ بھی بڑھایا یا گھٹایا، یا بدلا جائے تو وہیں مطلب خبط ہو جائے، یہ دوسری بات ہے کہ اس فن کی تدوین ہی میں اصولی غلطیاں ہوئی ہیں جن سے اس کے بہت سے مسائل قرآن کے خلاف پڑتے ہیں کیونکہ یہ مصنف کا قصور نہیں ہے۔

دوسری یہ کہ نہ صرف عقائد و اصول و فقہ بلکہ منطق و فلسفہ و ہیئت وغیرہ پر بھی جو غیر شرعی علوم ہیں، قدامت کے تقدس کا ایک غلاف چڑھا دیا گیا ہے اور جو کچھ کتابوں میں لکھا جا چکا ہے، اساتذہ کی نگاہوں میں آخری الفاظ بلکہ مسلمات ہیں جن میں چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے۔ میری طبیعت میں کچھ تو فطرۃً تنقید کا مادہ ہے اور کچھ والد کی تعلیم نے اس سونے پر سہاگہ کا کام کیا جو بار بار یہ حقیقت ذہن نشین کراتے رہتے تھے کہ سوائے ان چیزوں کے جن پہ تم ایمان لائے ہو، ہر شئے پر تم کو تنقید کا پورا حق حاصل ہے اس لئے میں ان مصنفوں کی بزرگی کا لحاظ رکھتے ہوئے بھی اُن کی جن باتوں کو غلط سمجھتا تھا، اُن پر اعتراض کرتا تھا۔ میرے استاد اس رویہ کو پسند نہیں کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ شرح عقائد نسفی پڑھتے وقت میں نے ملا عبدالحکیم کی ایک صریح غلطی نکالی جو انھوں نے خیالی کی توضیح میں کی ہے۔ استاد نے باوجود اس کے کہ ان کی مدافعت نہ کر سکے اُن کو اعتراضات سے بالاتر قرار دیا۔ اور ان کی شان میں یہ اشعار سنا کر مجھے خاموش کر دیا۔

خیالات خیالی بس بلند است　　درانجا جائے قلِ احمد نہ چنبد است

ولے عبدالحکیم خوش خصالی　　کہ حل کردہ خیالات خیالی

یہ استاد غیر مقلد تھے مگر مقلد یا غیر مقلد کسی کی تخصیص نہیں، مسلمان من حیث القوم صدیوں سے ماضی پرستی میں مبتلا ہیں۔ اُن کی مثال مکہ کے اس نانبائی کی ہے جو باسی روٹی کو تازی سے زیادہ قیمت پر بیچتا تھا۔ کسی نے سبب پوچھا تو کہا کہ وہ اس سے مقدم اور عہدِ رسالت سے ایک

رات قریب تر ہے اس لئے اس کے دام زیادہ ہیں۔

اب اگر پوچھیئے تو ایک مدت تک غور و فکر کرنے اور نتائج کو دیکھنے کے بعد ان درسی علوم کی نسبت جو مشرقی مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں میرا خیال یہ ہے کہ اُن میں سے اکثر مُردہ علوم کی لاشیں ہیں جن کو ہمارے اساتذہ صدیوں سے اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں اور جن کی عفونت سے عقل اور دین کوسوں دور بھاگتے ہیں۔

میں اس میں کسی تبدیلی یا ترمیم کا قائل نہیں ہوں بلکہ کئی انقلاب چاہتا ہوں۔ میری رائے یہ ہے کہ طلباء کو عربی زبان پختہ طور پر پڑھا کر خالص قرآن و سنتِ متواترہ یعنی عمل بالقرآن کی تعلیم دینی چاہیئے اور بس۔ اس کے بعد اُن کو زندہ دنیاوی علوم سکھانے چاہئیں جن سے وہ روزی پیدا کر سکیں اور دین کو دنیا کمانے اور ملت میں تفرقہ ڈالنے کا ذریعہ نہ بنائیں۔

مجھے امید ہے کہ امت میں جس دن مرکزیت آجائے گی اور اجتماعی مقاصد کی تشکیل ہوگی اس دن سوائے قرآن کریم کے کوئی دوسرا دینی نصاب ہمارا قرار نہ پاسکے گا۔

تربیت

والد نے ہم کو پوری آزادی دے رکھی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اصلاح وہی ہے جو خود اپنے علم سے ہو۔ کسی بزرگ کا یہ مقولہ کئی بار اُن کی زبان سے سنا۔ طَلَبْنَا الْعِلْمَ لِلدُّنْیَا لٰکِنْ اَبَی الْعِلْمُ اَنْ یَّکُوْنَ اِلَّا لِلّٰہِ۔ صرف ایک چیز تھی جس کی خاص طور پر وہ تاکید رکھتے تھے یعنی جاہلوں کی صحبت سے پرہیز۔

ہم نے محل کے نیچے کا ایک بڑا حصہ جو مسجد کی جانب ہے، پڑھائی کے لئے مخصوص کر رکھا تھا، اس میں دن بھر میں اور میرے دس بارہ ساتھی رہتے تھے۔ سوائے پڑھنے پڑھانے اور علمی بحثوں کے کوئی دوسری بات نہ تھی اور نہ وہاں کوئی بجز اہل علم یعنی علماء و طلباء کے آتا جاتا تھا۔ والد بھی اس میں بیٹھا کرتے تھے اور اکثر اسی جگہ پڑھاتے بھی تھے۔ وہ ہمیشہ خود بشاش رہتے تھے اور ایسا ہی ہم کو بھی دیکھنا چاہتے تھے، اُن کی محبت اور عظمت کا گھر بھر پر اس قدر اثر چھایا ہوا تھا کہ اُن کی منشا کے خلاف کوئی بات نہیں ہوسکتی تھی۔ اگر احیاناً کوئی غلطی ہو جاتی تھی تو متنبہ کر دیتے تھے مگر دلپذیر انداز کے ساتھ نہ تحکمانہ۔

ایک بار رسالے کے دو افسر ملنے کے لئے آئے۔ جب اوپر آکر والد کے پاس بیٹھ گئے تو میں چبوترے سے نیچے اترا اور ان کے گھوڑوں میں سے ایک گھوڑے پر سوار ہوا۔ محل کے سامنے ایک بڑا احاطہ ہے جس میں منشی امتیاز علی صاحب وزیر کی توجہ سے جو صدر منزل میں ہمارے بالمقابل رہتے تھے چاروں طرف سڑک چھوڑ کر اس وقت ایک خوشنما چمن لگایا گیا تھا۔ اسی سڑک پر میں نے گھوڑے کو تیزی کے ساتھ دو چکر دیئے۔ والد نے ٹاپوں کی آواز سنی ہو گی اور یہ بھی اندازہ کر لیا ہو گا کہ کون ہے۔ جب میں اوپر آیا تو اپنے قریب بلا کر یہ جملہ فرمایا جو ایک حدیث کا ٹکڑا ہے:

إِنَّكَ امْرَءٌ فِيْكَ جَاهِلِيَّةٌ ـ

بھوپال میں اس زمانے میں ایک حنفی مولوی جو نیک اور پرہیزگار تھے روزانہ صبح کو اپنے محلہ کی مسجد میں قرآن کا ترجمہ سنایا کرتے تھے شہر کے لوگ دور دور سے اس میں آکر شریک ہوتے تھے۔ والد کی محفل میں ایک ڈاکٹر صاحب نے اُن کے ترجمہ کی تعریف کی اور اسی کے ساتھ اُن کی علمیت کی بھی مدح کرنے لگے۔ میں جانتا تھا کہ وہ صرف علوم دینیہ سے واقف ہیں اور معقولات نہیں جانتے اور میرے نزدیک اس وقت جو معقولی نہ ہو وہ عالم کہے جانے کا مستحق نہ تھا۔ اس وجہ سے بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا کہ اُن کو علم سے کیا واسطہ۔ والد نے میری طرف دیکھا اور یہ شعر پڑھا:

وَمَا عَبَّرَ الْاِنْسَانُ عَنْ فَضْلِ نَفْسِہٖ   بِمِثْلِ اعْتِقَادِ الْفَضْلِ فِیْ کُلِّ فَاضِلٍ

ایک دن ہم کئی طالب علم کسی بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ والد مغرب کی جماعت پڑھ کر آگئے، ہم کو اس حالت میں دیکھ کر بولے کہ کیسے شیاطین ہیں کہ جماعت کا بھی خیال نہیں رکھتے۔ عمر بھر میں یہی ایک سخت لفظ تھا جو ہم نے ان کی زبان سے اپنی بابت سنا۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اس موقع پر اس کا استعمال بجا نہ تھا۔

ان کا برتاؤ ہم سب کے ساتھ یکساں تھا، خاص کر حافظ عبدالاعلیٰ اور میرے درمیان میں تو وہ کسی امر میں تفریق جائز ہی نہیں رکھتے تھے، یہاں تک کہ ہم دونوں کے لباس بھی بالعموم ایک ہی کپڑے کے ہوتے تھے۔ مگر ایک بات کا مجھے علم تھا جس کی وجہ سے یہ ظاہری مساوات ناگوار نہیں تھی۔ وہ یہ کہ میرے رات کے رہنے کا کمرہ اوپر والد کے کمرے کے بازو میں تھا۔ گرمیوں میں

جب وہ سائبان میں تہجد کی نماز پڑھتے تھے تو میں ان کی دعائیں سنتا تھا۔ دین اور دنیا کی کونسی خوبی تھی جس کو میرے لئے نہیں مانگتے تھے۔ خاص کر جب وہ مجھ کو اللہ کی امانت قرار دے کر الحاح و زاری کے ساتھ اس کی حمایت اور حفاظت میں سپرد کرتے تھے۔ اس وقت فرط مسرت سے بستر میں پڑے پڑے میری آنکھوں سے آنسو کے قطرے تکیے پر ٹپک پڑتے تھے اور دل ہی دل میں آمین آمین کہتا تھا۔ اس لئے میں جانتا تھا کہ ان کے دل میں میرا کیا مقام ہے اور سمجھ گیا تھا کہ باپ کا رشتہ بیٹے کے ساتھ صرف جسمی نہیں بلکہ روحی بھی ہے۔

انھوں نے ہمارے لئے ایک استاد بھی مقرر کر دیا تھا جو روزانہ شام کو آکر بانک، بانا اور بنوٹ وغیرہ سکھاتے تھے جس سے ورزش بھی ہو جاتی تھی۔ میں نے بندوق کی نشانہ بازی کی بھی مشق کی تھی مگر شکار کی اجازت اسی وقت ملتی تھی جب ریاست کے دورے میں کبھی والد کے ساتھ ہوتا تھا۔

عرب

والد کو عربوں کے ساتھ بہت محبت تھی۔ وہ ہمیشہ ایک نہ ایک عرب خواہ بطور طالب علم خواہ بطور مہمان اپنے یہاں رکھا کرتے تھے۔ جب ہم نے عربی شروع کی تھی اس وقت نجد کے ایک جوان صالح علی بن ماضی ہمارے یہاں رہتے تھے جو نہایت مستعد طالب علم تھے۔ والد کا صحیح بخاری کا درس مشہور تھا۔ جس دور میں علی بن ماضی تھے وہ یادگار دور تھا۔ اس میں اچھے اچھے مشہور اہل علم شریک تھے۔ مثلاً مولوی عبدالحمید بنگالی۔ بمبئی کے مولانا دیانت اللہ، بہار کے مولانا حسرت علی، ٹونک کے سید محمد عرفان وغیرہ جن میں سے ہر ایک اپنے اپنے ناحیے کا مقتدا تھا، ان میں سے اکثر ایسے تھے جن کی عمریں خود والد سے زیادہ تھیں۔ یہ لوگ ۱۶۔ ۱۷ آدمی تھے، جس وقت سبق کے لئے بیٹھتے والد کا کمرہ داڑھیوں سے بھر جاتا۔ انھیں میں مولانا افضل تھے جن کی حنائی داڑھی اس قدر بڑی اور گھنی تھی کہ آج تک میری آنکھوں نے ایسی داڑھی نہیں دیکھی۔ یہ جہانگیر آباد میں رہتے تھے جو ہمارے مکان سے دو میل کے فاصلے پر ہے اور وہاں سے روزانہ دوپہر کے وقت آتے تھے۔

لطیفہ

اسی زمانے میں بھوپال میں ایک حافظ صاحب تھے جن کی داڑھی مولانا افضل سے دوئم درجہ کی سمجھی جاتی تھی۔ وہ چونکہ نقوش، تعویذات اور عملیات کا پیشہ رکھتے تھے جس میں یہ شے بہت کارآمد ہوتی ہے، اس وجہ سے مختلف روغن استعمال کرکے اس کو اور بڑھانے کی کوشش کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب مولانا افضل کا انتقال ہوگیا تو چند زندہ دل حافظ صاحب کے پاس پہنچے اور ان کو اس بات کی مبارکباد دی کہ اب آپ کی داڑھی شہر بھر میں بے نظیر ہوگئی۔

علی بن ماضی حدیث ختم کرکے نجد چلے گئے۔ والد کی زندگی تک ما نجد کی تصنیفات جہاں کہیں بھی چھپتی تھیں برابر بھیجتے رہتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد مکہ کے ایک بزرگ عرب جو شریف صاحب بولے جاتے تھے، کئی سال ہمارے یہاں مہمان رہے۔ بڑے جہاں دیدہ اور خوش طبع تھے۔ دن بھر ان کا سماوار گرم رہتا تھا۔ عربی کتابیں اور فصیح بولتے تھے۔ مجھ سے فارسی بھی سیکھ لی اور چند مہینوں میں اس میں بھی گفتگو کرنے لگے۔ آخر میں عبداللہ آیا یہ ایک نجدی نوجوان تھا نہایت وحشی مگر بے حد نجتی۔ اردو ایک حرف نہیں جانتا تھا، اس کو حجرہ موتی مسجد میں دلا دیا گیا تھا لیکن ہر شخص سے لڑتا تھا، اس لئے دن بھر میرے ہی پاس رہتا تھا۔

عاشورہ کے دن کہنے لگا کہ میلا دیکھنے چلو۔ میں نے سمجھایا کہ یہ مشرکانہ رسم ہے جس میں شریک ہونا گناہ ہے پھر میرے والد واعظ شہر اور موحدوں کے سرگروہ ہیں لوگ کیا کہیں گے مگر وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ میں نے بھی یہ میلا کبھی نہیں دیکھا تھا اس کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ خیال تھا کہ والد کو خبر نہ ہوسکے گی مگر دوسرے دن کسی نے کہہ دیا۔ مجھے بلایا اور پوچھا کہ کل تم کربلا میں گئے تھے؟ یہ سوال ایسا اچانک تھا کہ میں سننے کے لئے تیار تھا نہ جواب دینے کے لئے، خاموش کھڑا رہا۔ وہ تیز نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ کہنے لگے بولو۔ میں نے کہا کہ اگر میں اپنی آنکھوں سے ایسے مقامات کو نہ دیکھوں گا تو اُن میں جو خرابیاں ہیں ان کا علم مجھے کیونکر ہوگا۔ یہ جواب سنتے ہی ان کے چہرے سے عتاب کا رنگ جاتا رہا، اب صرف یہ شکایت رہ گئی کہ ننگے سر ٹوپی لگا کر

اور ہاتھی پر سوار ہو کر میلے میں جانا خود اپنی توہین ہے اور علم کی اہانت ۔

ہم سبق

حفظِ قرآن کے بعد میرے خاندان کے دو تین لڑکے بھوپال میں آ گئے تھے جو میرے ساتھ پڑھتے تھے ۔ جب میں نے عربی شروع کی اس وقت بعض اعیان و امراء بھوپال یہ سوچ کر کہ مولانا اپنے اکلوتے بیٹے کو خاص توجہ کے ساتھ پڑھائیں گے اپنے اپنے بیٹوں کو میرے ساتھ پڑھنے کے لئے بھیجنے لگے ۔ قطبی اور میر قطبی تک ۱۷ ۔ ۱۸ ہم سبق ہو گئے ۔ دن بھر ہمارا مدرسہ خوب آباد رہتا تھا مگر پھر یہ تعداد گھٹ گئی ۔ کیونکہ ہم ذہنی زندگی کی گہرائیوں میں اس قدر گھس گئے تھے کہ مطالعہ اور سبق ، تکرار اور بحث ہمارے لئے دماغی آسائش کی چیزیں بن گئی تھیں ۔ اس لئے یہ نازوں کے پالے جن کی علمی بنیادیں بھی کمزور تھیں ہمارے ساتھ کیسے چل سکتے تھے مگر ان سے جو تعلقات پیدا ہو گئے تھے وہ برابر قائم رہے ۔ میرے ساتھیوں میں سے دو شخص صحیح معنوں میں طالب علم اور سچے رفیق تھے ان کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں ۔

عبدالغفور

یہ کشمیر کے رہنے والے ۲۲ ۔ ۲۳ سال کے نوجوان تھے ۔ مختلف شہروں سے تحصیل علم کرتے ہوئے بھوپال آئے اور ہمارے ساتھ مقامات حریری میں شریک ہوئے ، اُن کو ادب کے ساتھ خاص ذوق تھا ۔ جاہلی شعراء سے لے کر متاخرین تک کے چیدہ چیدہ ہزاروں اشعار ، سینکڑوں لطائف اور نکات ازبر تھے ، یہی حال فارسی میں بھی تھا ۔ ان کی وجہ سے میرے ادبی ذوق میں بہت ترقی ہوئی ۔

اسی زمانے میں ٹونک کے ایک نامور ادیب مولوی محمد صاحب اعرج ہمارے قرب میں رہتے تھے ۔ وہ اپنے وقت کے حماد الراویہ تھے ۔ عربی کا کونسا پسندیدہ کلام تھا جو ان کو یاد نہ تھا ۔ خود بھی بے تکلف عربی نعتیں اور قصیدے لکھتے تھے ۔ ہم دونوں اکثر ان کے پاس جا کر بیٹھا کرتے ۔ عبدالغفور کی آواز اچھی تھی اور شعر پڑھنے کا انداز دلکش ۔ روح کی پوری حدت صرف کر دیتے تھے ، چہرے پر پسینے کے قطرے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے گلاب کے پھول پر شبنم کی بوندیں ۔ میں نے ایک بار شیخ ابن الفارض کا قصیدہ تائیہ خمریہ جو مجھے پسند ہے ان سے پڑھوا کر سنا ۔ بے حد

لطف آیا۔ خاص کر اس شعر پر پہنچ کر تو وجد کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔

لها صلواتي بالمقام أقيمها وأشهد فيها أنها لي صلّت [7]

چند روز کے بعد عبدالغفور خود اسی وزن اور قافیہ میں ۶۰۔۷۰ شعروں کا قصیدہ لکھ کر لائے اور سُنایا۔ میں غور سے سنتا رہا کہیں حرف رکھنے کی جگہ نہ تھی، خوش ہو کر اُن سے کہا کہ لاؤ وہ ہاتھ دو جس سے اس کو لکھا ہے تاکہ چوم لوں۔

انھوں نے آخر میں میرا بھی ذکر کیا تھا اور جوش میں یہاں تک کہہ گئے تھے کہ: [8]

فيا ليتني يوماً أكون كمثله ويا ليتني يوماً أفوز بمنيتي

اس لئے میں نے کاغذ اُن کے ہاتھ سے لے لیا اور اس پر یہ اشعار لکھ دیئے۔ [9]

محيّاك يا عبد الغفور مسرّتي ولقياك ريحاني وروحي وجنّتي

وصوتك في سمعي كأطرب نغمة وشعرك في قلبي كأطيب لذّتي

وخلقك روض من رياض لطيفة وحسنك من آلاء ربّ البريّة

ففي أيّ شيء خلتني منك فائقاً وفي أيّ وصف انتصبت لغبطتي

توقیر الحسن

دوسرے ہم سبق جن کی محبت سے میرا دل لبریز ہے توقیر الحسن تھے۔ یہ بہار کے رہنے والے تھے جہاں کا پانی چالیس دن اگر کوئی غبی بھی پی لے تو ذہین ہو جائے۔ مولوی عبدالوہاب صاحب بہاری دکن سے اپنے وطن جاتے ہوئے جب بھوپال میں ٹھہرے تھے تو اُن کے ساتھ چند طالب علم بھی تھے جن میں سے توقیر کو قسمت نے ہمارے لئے چُن لیا۔ یہ بھوپال ہی میں رہ گئے اور ہدایہ و حمد اللہ میں ہمارے ساتھ ہوگئے۔ دُبلے، دراز قد، نہ جسم نہ صورت مگر دل اور دماغ ایسا کہ کمتر کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ وہ اگرچہ ابراہیم پورہ کی مسجد میں مقیم تھے مگر صبح سے شام تک میرے ہی پاس رہتے تھے۔ روزانہ علمی مسائل پر بحث ہوتی تھی اور جمعہ کا دن تو اس کے لئے مخصوص تھا۔ ہم نے رشیدیہ میں مناظرہ کے جو اصول پڑھے تھے انھیں کو پیشِ نظر رکھتے تھے ہماری بحثیں دراصل مل جل کر کسی مسئلہ کی تحقیق کے مرادف تھیں اور جدل و مکابرہ سے یکسر خالی۔ جس سے باہمی محبت میں فرق نہیں آتا تھا۔

ایک بار مجھے صدر کی شکایت تھی۔ توقیر ملنے کے لئے اوپر آئے۔ ڈاکٹر ولی محمد نے جو میرے معالج تھے "وائن آف کاڈلور آئل" کی شیشی استعمال کے لئے دی تھی۔ اس سے مجھے نمایاں فائدہ تھا۔ توقیر نے جب اس کو دیکھا تو کہا کہ یہ تو شراب ہے حرام، جس میں کوئی نفع نہیں۔ میں نے کہا کہ کتابیں دیکھنے کے بعد اس کی حرمت ثابت کرنا۔ جمعہ کے دن جب بحث ہوئی تو ہم کسی قطعی فیصلہ پر نہیں پہنچ سکے۔ دوسرے جمعہ کو ایک مولانا صاحب حکم مانے گئے۔ انھوں نے فریقین کی تقریریں سن کر میرے دلائل کو قوی بتایا۔ مجھے خوشی تو ہوئی مگر ساتھ ہی دل میں یہ اضطراب پیدا ہوا کہ توقیر کو رنج نہ پہنچا ہو کیونکہ میں نے تیمور کے سامنے سید شریف اور علامہ تفتازانی کی بحث کا حال سنا تھا کہ کسی درباری نے کہدیا کہ سید کی تقریر جیت تھی، اس صدمہ سے علامہ تفتازانی صاحب فراش ہو گئے۔ لیکن جس وقت ہم کمرہ سے نکلنے لگے تو توقیر نے مسکرا کر کہا کہ در اصل جو پہلو میں نے اختیار کیا تھا وہ کمزور تھا، یہ سن کر میرے دل کا کانٹا نکل گیا، خوش ہو کر ان سے لپٹ گیا اور کہا کہ تم کس قدر حق شناس ہو، تمھاری انصاف پسندی پر مجھ کو رشک ہے۔

ایک روز مولوی محمد بشیر صاحب والد سے ملنے آئے۔ ہم لوگ بھی جا کر ان کے پاس بیٹھے۔ اثنائے گفتگو میں انھوں نے فرمایا کہ طالب العلمی کے زمانے میں میں اور میرے ایک ہم سبق تقلید شخصی کے متعلق بحث کیا کرتے تھے اور ہمیشہ اسی نتیجے پر پہنچتے تھے کہ وہ جائز نہیں ہو سکتی۔ کوئی عالم خواہ اپنے دو چار شاگردوں یا معتقدوں کو لے کر اگر اپنے تجربے میں رائے اور قیاس سے ایک فقہ مرتب کر دے تو وہ اُمت کے لئے دائمی شرعی قانون کیسے بن سکتی ہے، یہ شرک فی النبوۃ ہی نہیں بلکہ شرک باللہ ہے کہ کسی غیر مامور کا قول بلا دلیل اس طرح تسلیم کیا جائے جس طرح اللہ کا قول، اسی کو قرآن کی زبان میں "ند" کہا گیا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا (البقرۃ)

میرے اور توقیر کے لئے یہ ایک عمدہ مبحث ملا، مگر مشکل یہ تھی کہ ہم دونوں اس عالم میں بستے تھے جس کے آسمان کے نیچے اور جس کی زمین کے اوپر تقلید شخصی کا وجود ہی نہ تھا، پھر اس کے متعلق بحث کیا کرتے، لہٰذا ہم نے یہ تحقیق شروع کر دی کہ تقلید مسلمانوں پر مسلط کیونکر ہوئی۔ کئی ہفتے کی محنت اور کوشش کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ فقہ جو شرعی قوانین کا نام ہے اس کی ترتیب خود مرکز کا فریضہ

ہے اور اس کو ہر ماحول میں ضرورت کے مطابق اس میں ترمیم و تنسیخ و تبدیلی کا اختیار ہے۔ خلافت راشدہ
کے بعد متغلبین نے جو مرکزیت پر قابض ہوگئے تھے اپنے اس فریضے کا لحاظ نہیں رکھا اور امورِ سلطنت
کے عملدر آمد کے لئے کسی ایک عالم کی فقہ اختیار کر لی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کو اجتہادِ مطلق کا دروازہ
بھی بند کرنا پڑا تاکہ ان کی مروجہ فقہ سے تصادم نہ ہوسکے۔ اس طرح پر استبداد نے جہاں مسلم کو
حریتِ عمل سے محروم کیا تھا وہاں حریتِ فکر بھی اس سے غصب کر لی، نتیجہ یہ ہوا کہ ساری امت شخصی
حکومت کی طرح شخصی تقلید میں گرفتار ہوگئی۔ چونکہ مختلف استبدادی سلطنتوں نے مختلف علماء
کی فقہیں اختیار کیں۔ اس لئے امت متعدد فرقوں میں بٹ گئی۔ ان مقلدین کا اختلاف بظاہر فروعی
سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت میں اصولی ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک اپنے مخصوص امام کی تقلید کا بھی
عقیدہ رکھتا ہے، لہٰذا جس طرح سنی اور شیعہ میں اصولی اختلاف ہے اسی طرح اہلِ سنت کے
مذاہب اربعہ بھی جدا جدا فرقے ہیں۔ ہر ایک کے امام الگ الگ ہیں، کتابیں الگ الگ ہیں اور
علماء الگ الگ ہیں۔

اس نتیجے پر پہنچتے ہی دفعۃً حدیث کی حالت بھی سامنے آگئی کہ وہ بھی مرکز سے نہیں ملی ہے یعنی
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے صحیح جانشینوں نے اس کا کوئی مجموعہ مرتب کر کے امت کے
حوالہ نہیں کیا۔ بلکہ تمام تر رواۃ سے ملی ہے، جنھوں نے رضاکارانہ اس کو روایت کیا ہے اور
ان کا کوئی مرکزی حیثیت نہیں تھی۔

اس حقیقت پر نگاہ پڑتے ہی میری روح لرز اٹھی اور میں نے کہا یا اللہ! سوائے تیری
کتاب کے کہیں پناہ نہیں ہے جیسا کہ تو نے خود فرمایا ہے۔ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُونِهِ مُلْتَحَدًا۔

حدیث کے متعلق

یہ خیال اس وقت اس دل میں بمنزلہ تخم کے پڑ گیا جو برابر پرورش پاتا رہا۔ ۱۹۰۲ء میں
مجھ کو معلوم ہوا کہ مولوی عبد اللہ صاحب چکڑالوی حدیث کے قائل نہیں ہیں، ان سے جاکر ملا تین
روز تک گفتگو رہی جس کو انھوں نے اس بحث میں ضائع کر دیا کہ رسول کا لفظ کلام مجید میں
جہاں جہاں آیا ہے اس سے مراد قرآن ہے نہ کہ ایک مخصوص انسان۔ میں نے دیکھا کہ وہ
سنت آشنا نہیں ہیں، انھوں نے سنتِ متواترہ یعنی عمل بالقرآن کا انکار کر دیا تھا۔ اس وجہ

سے سخت مشکل میں گرفتار تھے اور سوائے تاویلات رکیکہ کے عمل کے لئے کوئی راستہ نہیں پاتے تھے۔
پھر دوبارہ کبھی ان کی ملاقات کا موقع نہیں ملا۔

جب قرآنی حقائق اللہ نے میرے دل پر کھولے اس وقت حدیث کی اصلی حیثیت بالکل واضح ہوگئی کہ وہ دینی تاریخ ہے۔ خود اس کو دین سمجھنا صحیح نہیں، اگر دین ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم کی طرح اس کو بھی لکھوا کر اُمت کو دے جاتے۔ دین کے لئے قرآن کافی ہے جو کامل کتاب ہے اور جس میں دین مکمل کر دیا گیا ہے۔

کچھ قرآن کی نسبت

قرآن کو میں نے توجہ اور محنت کے ساتھ پڑھا تھا لیکن جس طرح ہمارے مفسرین نے اس کو ایک علمی اور نظری کتاب بنا رکھا ہے اسی طرح میں بھی سمجھتا تھا۔ زیادہ توجہ علمی و ادبی لطائف یا فقہی و کلامی دلائل کی طرف تھی اور حقائق، جن کی تعلیم کے لئے وہ نازل کیا گیا ہے، نظروں سے نہاں تھے۔ ایک بار میں نے ایک خواب دیکھا جس کے بعد سے میری نگاہ میں حقائق کا جلوہ شروع ہوا۔ میں اپنے جیسے لوگوں کے خوابوں کا کچھ زیادہ قائل نہیں ہوں۔ لیکن اس خواب کا اثر چونکہ میری زندگی پر پڑا ہے اس وجہ سے بیان کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

۱۹۱۲ء میں جب میں علی گڑھ کالج میں مدرس تھا ایک رات خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک پہاڑی پر اکیلا گھوم رہا ہوں۔ اس کے دامن میں سرسبز وادی ہے جس میں کہیں کہیں پھول بھی نظر آتے ہیں، وادی کے وسط میں ایک عمارت تھی، میں پہاڑی سے اتر کر اس کی طرف گیا، جب قریب پہنچا تو دیکھا کہ تمام تر سنگِ سرخ کی بنی ہوئی ہے۔ چاروں طرف سے سیڑھیاں ہیں، سیڑھیوں کے اوپر پہنچ کر ایک چبوترہ بن گیا ہے جس کے چاروں کونوں پر چار بڑے بڑے کمرے ہیں، ان کے درمیان تقریباً تین تین گز چوڑے راستے مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک ہیں، ان چاروں کمروں کے بیچ میں ایک گنبد ہے جو بہت بلند نہیں ہے۔ میں مشرق کی جانب سے چڑھا تھا، جب گنبد کے نیچے پہنچا اور اوپر کی طرف دیکھا تو اس میں پانچ غیر مادی انسانی پیکر جو نورانی تھے اس طرح نظر آئے جیسے فانوس میں تصویریں ہوتی ہیں۔ ان سب میں ایک پیکر زیادہ ممتاز تھا۔ میں حیرت سے دیکھنے لگا۔ یہاں تک کہ ان میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ روشنی کی طرح نیچے

اتر کر جنوبی رخ کی سیڑھیوں سے چلے گئے۔ اس کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ مغربی جنوبی کمرے سے بہت سے آدمی جلدی جلدی نکل کر اس کے سامنے والے شمالی کمرے میں گھس رہے ہیں، کوئی کسی سے بولتا نہیں، سب چپ ہیں، سب سر برہنہ ہیں اور جوان، سب کے سروں پر سیاہ گیسو ہیں اور چہروں پر سیاہ داڑھیاں، ہر ایک کے جسم پر ایک ہی لباس ہے یعنی گردن سے پنڈلیوں تک سیاہ اطلس کی عبائیں جو کمروں پر پیلے ریشم کی ڈوریوں سے بندھی ہوئی ہیں۔ میں نے ان میں سے ایک کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا کہ یہاں کیا ہے؟ بولا کہ حفاظ جماعت پڑھیں گے۔ میں نے کہا کہ میں بھی شریک ہو جاؤں۔ اس نے کہا کہ بیشک۔ سلام پھیرتے ہی وہ اسی طرح جلدی جلدی جنوبی کمرے میں جانے لگے جس طرح اس سے نکلے تھے۔ [illegible] نکلتے ہی گنبد کی طرف گئے اور میں نے دیکھا کہ وہ پانچ سات [illegible] بیٹھے [illegible]۔ اب میں نے ان نمازیوں میں سے ایک کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس ممتاز بزرگ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ اس نے کہا کہ تم نہیں پہچانتے؟ یہ حضرت یوسفؑ ہیں۔ میں نے کہا ان کے بعد؟ اس نے جواب دیا کہ ابوبکرؓ۔ پھر میں نے کہا پھر کون ہے؟ بولا کہ عمرؓ۔ میں [illegible] کہا کہ یوسفؑ کے ساتھ ابوبکرؓ و عمرؓ!! معلوم ہوا تھا کہ یہ ہمارے یوسف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اسی کا دل کو یقین آ گیا اور میں نے تعظیم کے ساتھ سلام کیا۔ آپ نے ایک شخص سے میری طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ فلاں کا بیٹا فلاں آ گیا ہے، اس کی امانت اس کے حوالہ کر دو۔ وہ مسکراتا ہوا میری طرف آیا، پہلے ایک کلام مجید دیا [illegible] میں نے دائیں بغل میں دبایا۔ پھر سات رنگ کے شیشوں کی ایک بڑی ریل جس کو بائیں بغل میں رکھا۔ اس کے بعد ایک قلمدان جس کو دائیں ہاتھ میں لیا۔ یہ چیزیں پا کر میرا دل خوشی سے معمور ہو گیا۔ میں نے گردن جھکا کر شکریے کا سلام کیا اور ان کو لئے ہوئے مغربی سیڑھیوں سے اتر کر چلا آیا۔

اس کے بعد سے روزانہ تلاوت میں فہم معانی کا نیا راستہ کھلنے لگا یعنی آیات کی تفاصیل خود آیات سے سمجھ میں آنے لگیں اور قرآنی حقائق کے چہرے سے نقاب اٹھنا شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ ایک مدت مدید کے بعد دو حقیقتیں عین الیقین بن کر سامنے آ گئیں۔

(۱) قرآن شریف [illegible] لاثانی اور بے مثال کتاب ہے جو ہر زمان و مکان میں انسانی بصیرت کی تنویر اور اس کی ہدایت کے لئے کافی ہے۔

(۲) قرآن مفصل کتاب ہے جو اپنی تشریح میں سوائے عربی زبان کے مطلقاً کسی روایت یا انسانی خیال کا محتاج نہیں ہے، اس کی ہر آیت بلکہ ہر لفظ کی تفسیر خود اسی میں ہے اور اختلافِ فہم کی صورت میں حقیقی مفہوم کے تعین اور فیصلہ کی وہ پوری قدرت رکھتا ہے۔

ان حقیقتوں کے ظہور سے قرآن اپنی پوری معجزانہ شکل میں میری بصیرت کے سامنے آگیا اور مجھے نظر آنے لگا کہ کیوں اس کی تعلیمات ہدایت، رحمت، نور، شفاء لما فی الصدور بلکہ سرتاسر نجات ہیں۔

اس نعمتِ عظمیٰ پر میں اپنے رب کا شکر گذار ہوں جس نے قرآن نازل فرمایا اور اس کو سمجھنے کی توفیق دی اور اس دربار کا بھی جہاں سے یہ امانت مجھے ملی اور اپنے باپ کا بھی جس نے مجھ کو قرآن حفظ کرایا، پھر اس کو دلسوزی کے ساتھ پڑھایا اور اپنی نیم شبی مناجاتوں میں میری ہدایت کے لئے رو رو کر دعائیں مانگیں۔

انھیں دونوں باتوں کو سمجھانے کے لئے میں نے تعلیمات قرآن لکھ کر شائع کی جو اسلام میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے یعنی قرآن کی تشریح خود قرآن سے اور اس کے کافی اور مکمل ہونے کی شہادت۔ یہ کتاب عقائد و اصول سے متعلق ہے۔ اب اسی نہج پر میرے مخلص رفیق چودھری غلام احمد خاں پرویز بی۔ اے نے پورے قرآن کی آیات کو ترتیب دیا ہے۔ یہ کتاب اگر شائع ہو گئی تو قرآن کو قرآن سے سمجھنا نہ صرف آسان بلکہ دلکش مشغلہ ہو جائے گا اور ترجموں اور تفسیروں سے یکسر بے نیازی ہو جائے گی۔[۱۳]

کاش آج توقیر الحسن زندہ ہوتے تو میرا ساتھ دیتے، بیچارے عبدالغفور کی زندگی تکمیل علم سے پہلے ہی ختم ہو گئی اور توقیر چند سال درس دینے کے بعد وفات پا گئے، اب جب کبھی یہ ہنستے بولتے میرے تصور میں آجاتے ہیں تو اس وقت کا پورا ماحول اپنے ساتھ لاتے ہیں اور مجھے کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں ؎

اے عیشِ رفتہ پھر تجھے پاؤں کہاں سے میں
جو دن گذر گئے انھیں لاؤں کہاں سے میں

دہلی میں میرے ساتھیوں میں سے مولوی عبدالحفیظ صاحب ہیں جو میاں صاحب کے

حقیقی بھتیجے ہیں۔ جب میں پڑھتا تھا اس وقت میاں صاحب نے ان کو بھوپال بھیجدیا تھا۔ یہ رہتے تھے شیخ حسین عرب کے یہاں اور پڑھتے تھے ہمارے ساتھ۔ سوائے دینی بحثوں کے اور کسی بحث میں کم حصہ لیتے تھے۔ اب جو کبھی اہل حدیث کے کسی جلسہ میں مل جاتے ہیں تو پرانی صحبتوں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔

اساتذہ

میرے استاد دراصل دو ہی تھے۔ مولوی فتح اللہ صاحب اور والد، ان کے حالات نہایت اختصار کے ساتھ لکھتا ہوں۔

مولوی فتح اللہ صاحب

موضع مہارہ ضلع اعظم گڈھ کے رہنے والے ہمارے ہم وطن تھے، انھوں نے والد سے اس زمانہ میں پڑھا جبکہ وہ بنارس میں درس دیتے تھے۔ والد نے اپنی مہتمی کے زمانے میں مدرسہ سلیمانیہ میں عربی کے مدرس دوم کی جگہ پر اُن کو بلالیا، پڑھانے سے عشق تھا، کبھی چھٹی نہیں لیتے تھے اور ہمیشہ وقت سے پہلے مدرسے میں پہنچ جاتے تھے۔ مدرس اول مولوی مظہر حسین صاحب کہ وہ بھی مہوارہ کے متصل موضع بھادوں کے رہنے والے تھے جب بھوپالی رباط کے منتظم بناکر مکہ مکرمہ بھیجدیئے گئے اس وقت ان کی جگہ مولوی فتح اللہ صاحب کو ملی، آخر میں یہ مدرسہ سلیمانیہ کے مہتمم بھی ہوگئے تھے پھر پنشن لے لی، سالِ گزشتہ یعنی ۱۹۳۶ء میں مارچ کے مہینے میں تقریباً ۸۲ سال کی عمر میں اپنے وطن میں انتقال کیا۔

جس وقت میں بھوپال پہونچا تھا اُن کی اہلیہ زندہ تھیں۔ وہ کبھی کبھی والدہ کے پاس بھی آیا کرتی تھیں لیکن اس کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد انتقال کرگئیں۔ مولوی صاحب نے پھر نکاح نہیں کیا، اُن کے کوئی اولاد بھی نہیں تھی۔ تنہا ایک چھوٹے سے مکان میں خیرن بی کی مسجد کے متصل جو ہمارے گھر سے کسی قدر فاصلے پر ہے رہتے تھے، نہایت باوضع اور پابندِ اوقات، نہ کبھی تہجد ناغہ ہوئی نہ جماعت الا ماشاء اللہ۔ لباس اور غذا میں صفائی اور سادگی کا بہت لحاظ رکھتے تھے۔ میں نے کبھی ان کو بیمار نہیں دیکھا۔ ملنسار ایسے کہ کسی کو اُن سے اور کسی سے اُن کو شکایت نہیں پیدا ہوئی۔ آخر میں دو حج بھی کئے، عام طور پر لوگ اور بالخصوص اہل محلہ ان کو قطب سمجھتے تھے، ایک بار ہماری

نامیں ان کی ذات زیرِ تنقید آئی، بجز اس کے کوئی دقت نہ ہوئی کہ کسی قدر زیادہ بولے گئے ...
گئے، انھوں نے جب ہماری رائے سنی تو فرمایا کہ خزغل پر دوشالہ بھی تو اوڑھتے ہیں اور سپوٹ
ند کے ساتھ کھاتے ہیں، ہم سب ہنسنے لگے۔

میں نے جب سے اُن سے پڑھنا شروع کیا اس وقت سے میرے اوپر اُن کی شفقت برابر بڑھتی
۔ وہ مجھ کو بمنزلہ فرزند کے گنتے تھے اور پدرانہ محبت رکھتے تھے۔ وفات سے چار سال پہلے ڈاکٹر
ف کو آنکھیں دکھانے اور مجھے دیکھنے کے لئے دہلی آئے تھے۔

لوی سلامت اللہ صاحب

یہ میرے والد کا نام ہے۔ تاریخ ولادت صحیح نہیں معلوم، مگر ایک بار اُن کی زبان سے سُنا
اکہ غدر ۱۸۵۷ء میں سات سال کے تھے ان کے باپ شیخ رجب علی جو درویش صفت آدمی
ے اور میاں صاحب بولے جاتے تھے اُن کو دس سال کا چھوڑ کر انتقال کر گئے۔ دو چھوٹی بہنیں تھیں اور
لدہ، کوئی سرپرست نہیں تھا۔ میاں صاحب نے کچھ ابتدائی تعلیم دیدی تھی جس کی وجہ سے علم کا شوق
یدا ہو گیا تھا۔ اس لئے گھر سے بے سروسامانی کے ساتھ نکلے اور جونپور میں جا کر مولوی حیدر حسین صاحب
ے مدرسے میں داخل ہو گئے۔ وہاں دس برس تک پڑھتے رہے۔ ذہانت، شوق اور محنت تینوں چیزیں
ن کے اندر جمع تھیں، اس وجہ سے ممتاز طالب علم مانے جاتے تھے۔ اس زمانے میں وہاں مفتی محمد یوسف
صاحب فرنگی محلی مدرس تھے جو علوم عقلیہ اور درویشی دونوں میں کامل تھے، ان سے درسی کتابیں پڑھیں،
پھر مولانا محمد قاسم دیوبندی علیہ الرحمۃ کے پاس جا کر ایک سال رہے اور وعظ و ارشاد کا طریق سیکھا،
اس کے بعد دہلی جا کر میاں صاحب سے دو سال تک حدیث پڑھی اور انھیں کا رنگ اختیار کیا۔

وطن میں واپس جانے کے بعد کتاب و سنّت کی ترویج اور شرک و بدعت کے مٹانے میں
مصروف ہوئے۔ جا بجا مواضع میں ان کی تلقین سے اہلِ حدیث کی جماعتیں پیدا ہو گئیں۔ قبر پرستی،
پیر پرستی اور تعزیہ پرستی کو ضلع کے اکثر حصے سے مٹا دیا۔ اس زمانہ میں جیراجپور میں جو لوگ اُن سے
حدیث پڑھتے تھے اُن میں مولوی عبدالرحمٰن صاحب مبارکپوری بھی تھے۔ [۱۳]

ہمارے گاؤں سے ملا ہوا ایک دوسرا موضع بندول ہے جہاں کے ایک معزز وکیل کے بیٹے مولوی
شبلی صاحب نعمانی اس زمانے میں تکمیلِ علوم کر کے آئے تھے، اُن کے اوپر تقلید کا غلبہ تھا۔ اس

بر سے انھوں نے والد کے ساتھ بعض امور میں مباحثہ کرنا چاہا، والد بحث کو ناپسند کرتے تھے مگر
کے بعض شاگردوں خاص کر مولوی اسد اللہ صاحب نے جو موضع رواں کے رہنے والے تھے
ابات دیئے اور طرفین میں رسالہ بازی ہوئی۔

دو سال کے بعد والد بنارس بلائے گئے۔ وہاں تلوچن محلے کے مدرسے میں پڑھانا شروع
۔ ان کے اس وقت کے شاگردوں میں سے اب صرف ایک شخص شمس العلماء مولوی حفیظ اللہ
حب سابق مہتمم دارالعلوم ندوہ لکھنؤ زندہ ہیں۔

بنارس میں والد کے تعلقات پنڈتوں کے ساتھ بھی ہو گئے تھے۔ ان سے یوگ کا فن سیکھا، چنانچہ
پال میں ہر جمعرات کی شام کو ان کے پاس شہر کے بڑے بڑے پنڈت روپ رام اور کنھیالال وغیرہ
جمع ہوتے اور یوگ کے مسائل سمجھتے۔ نیز جب کوئی نامی پنڈت پریاگ یا اجودھیا وغیرہ کا وہاں آتا
الد ایک رات ضرور اپنے یہاں محفل منعقد کر کے اس کو مع بھوپال کے پنڈتوں کے
تے اور گھنٹہ دو گھنٹہ علمی گفتگو کرتے۔ بنارس میں کم و بیش آٹھ سال رہے۔ پھر حج کو
، واپسی کے بعد بھوپال گئے۔

والد اگرچہ خالص اہلحدیث تھے مگر ان میں تعصب مطلق نہ تھا۔ ہر فرقہ اور ہر جماعت
وگ ان کے پاس آتے تھے اور جہاں تک ان کے بس میں ہوتا تھا سب کی مدارات اور مدد کرتے
کسی سے بحث یا جھگڑا بالطبع ان کو ناگوار تھا۔ ایک بار مولوی محمد بشیر صاحب نے ایک شیعہ
کو ریاست سے نکلوایا۔ والد کو جب اطلاع ہوئی تو فوراً مولوی صاحب کو سمجھانے کے لئے
مگر اس سے پہلے سرکاری احکامات نکل چکے تھے۔

مولوی محمد بشیر صاحب نے جب یہ مسئلہ نکالا کہ قربانی آخر ذی الحجہ تک سنت ہے اور اس
کا اعلان کیا تو لوگوں نے والد سے آکر بیان کیا کہ شاید اس کی مخالفت کریں گے مگر
نے مجھے حکم دیا کہ مولوی صاحب کے یہاں دام دے آؤ کہ جس دن وہ قربانی کریں اس
یک حصہ ہمارا بھی رکھیں۔

وہ واعظ شہر تھے اور ہر جمعہ کو جامع مسجد میں وعظ کہتے تھے اور اہل شہر بالعموم حنفی تھے۔
کسی کو ان سے شکایت نہیں پیدا ہوئی۔ بلکہ ہر چھوٹے بڑے میں ان کا وعظ مقبول تھا اور ان

کی شخصیت محبوب تھی۔ ریاستوں میں اکثر دنیاوی معاملات میں گروہ بندیاں رہا کرتی ہیں، وہ کبھی کسی فریق میں شامل نہیں ہوئے اور نہ کسی کی بیجا طرفداری کی۔

جس غربت میں انھوں نے تعلیم حاصل کی تھی اس کے لحاظ سے ان کی نگاہ میں روپیہ کی بہت قدر ہونی چاہیئے تھی مگر وہ اس کو ہاتھ لگانا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہمیشہ اُن کی تنخواہ خود ہی لاکر اپنے پاس رکھتا تھا اور خانگی ضروریات میں خرچ کرتا تھا۔ کبھی حساب تک نہیں پوچھا۔ ان کی توجہ تمامتر اسی پر مبذول رہتی تھی کہ خالق اور مخلوق دونوں کے ساتھ معاملہ کو صاف رکھیں تاکہ حساب کے دن بازپرس نہ ہو۔ جب کبھی ان کو بخار آتا تو گھر بھر کو اپنے گرد جمع کرکے وصیت کرنے لگتے جس کا ماحصل یہی ہوتا تھا کہ ظاہر اور باطن میں اللہ کا کوئی گناہ نہ ہونے پائے اور کسی بندے کا کوئی حق سر پر نہ رہ جائے۔ کیونکہ اللہ باوجود غفور و رحیم ہونے کے بھی حقوقِ عباد کو معاف نہیں کرے گا۔

جب نواب علی حسن خاں نے جو نواب صدیق حسن خاں کے بیٹے تھے محکمۂ تعلیم کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اس وقت شاہجہاں بیگم نے والد کی وہی تنخواہ جو مہتمی کی تھی محکمۂ مناصب میں منتقل کردی اور جملہ حقوق برقرار رکھے۔ شرط یہ تھی کہ بھوپال ہی میں رہ کر اپنے گھر پر طلباء کو پڑھاتے رہیں۔

میں تعلیم ختم کرنے کے بعد ۱۹۰۳ء میں پیسہ اخبار لاہور میں مترجم ہوکر چلا گیا۔ دوسرے سال جون کے مہینے میں والد کی علالت کا تار ملا، فوراً بھوپال آیا، ذات الجنب کا عارضہ تھا، مجھ کو دیکھتے ہی سر کو گود میں لے کر پیشانی پر بوسہ دیا اور کہا کہ تم اچھے بیٹے ہو، میں تم سے خوش ہوں۔ میں نے دل میں کہا کہ اے اللہ میرے باپ کے ان لفظوں پر تو گواہ رہنا، یہ میرے حساب کے دن کا ذخیرہ ہیں۔

دوسرے دن اُن کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی۔ عشاء کے وقت چارپائی سائبان میں تھی، دو ملازم پنکھا جھل رہے تھے، خیال تھا کہ نیند آگئی ہے۔ میں ان کے قریب ہی نماز پڑھنے لگا۔ یکایک انھوں نے زور کا ایک سانس لیا، نوکروں کو احساس بھی نہ ہوا مگر میرا دل کھٹکا، سلام پھیرنے کے بعد دیکھا تو وہی آخری سانس تھا، اُن کے سرہانے صحن میں ایک

چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اللہ کا احسان ہے جس نے رنج کے پہلے ہی حملے میں دل پر صبر انڈیل دیا۔ جہاں تک ہو سکا قرآن پڑھتا رہا لیکن تاہم وہ رات میرے اوپر سخت گزر گئی، وہ میری زندگی میں انقلاب کی رات تھی۔ والد کے چہرہ کے ساتھ دنیا جس قدر مجھ کو خوشنما نظر آتی تھی اُن کے بعد پھر کبھی ویسی نظر نہ آئی۔

اَلَا فَلْيَمُتْ مَنْ شَآءَ بَعْدَكَ اِنَّمَا　　　عَلَيْكَ مِنَ الْاَقْدَارِ كَانَ حِذَارِيَا

ان کا انتقال ۳ ربیع الاول ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۵ جون ۱۹۰۴ء کو ہوا۔

نماز فجر کے بعد شیخ حسین عرب آئے انھوں نے اپنے ہاتھوں سے غسل دیا۔ جب جنازہ لیکر نکلے تو باہر بڑا ہجوم تھا۔ محبت شاہ کے تکیہ میں جو نواب صدیق حسن خاں کے مقبرہ کے مشرقی جانب سڑک سے ملا ہوا ہے لے جا کر دفن کیا۔ آنے والوں کا تانتا نہیں ٹوٹتا تھا۔ تین بار جنازہ کی جماعت ہوئی۔

اس واقعہ کے ایک مدت کے بعد ۱۹۱۷ء میں مجھے بھوپال جانے کا اتفاق ہوا۔ والد کے مزار پر گیا۔ دیکھا کہ اس تکیہ کے متصل گوجروں کا ایک محلہ آباد ہو گیا ہے جن کی وجہ سے اس میں جا بجا گندگی پھیلی ہوئی ہے۔ دل کو سخت رنج ہوا۔ اسی دن مندرجہ ذیل نظم لکھ کر والیۂ بھوپال کی خدمت میں بھیجی۔

حضرتِ نواب سلطانِ جہاں گردوں وقار　　　آنکہ با صد حشمت و شوکت جہانبانی کند
فرّۂ اقبال اسمش راسمیٰ کردہ اند　　　درجہاں چوں نام خود بنگر کہ سلطانی کند
مادرِ مشفق بود بہرِ مسلمانانِ ہند　　　مشکلاتِ قومِ ما را حل بآسانی کند
نیتِ پاکش چو صافی تر ز آب گوہر است　　　در ہمہ کارش مدد تائیدِ یزدانی کند
مدح مقصد نیست اینجا مدعائے دیگر است　　　ورنہ آسلم ہم تواند آنچہ خاقانی کند

بندہ بر درگاہ تو یک التماس آوردہ ام　　　زیبد از لطفت نگاہے سوئش ارزانی کند
چوں پس از قرنے گذارِ من بہ بھوپال اوفتاد　　　جاوداں ز آفاتِ دہرش حق نگہبانی کند
بیقرارانہ دواں رفتم سوئے گورِ پدر　　　ہمچو پروانہ کہ گردِ شمع جولانی کند

دلِ پُر از سوزِ محبت چشم پُر از اشکِ غم | شمع ساں کز شعلۂ خود قطرہ افشانی کند
تکیۂ شاہِ محبت آنکہ مدفن گاہِ اوست | بندہ را از رشتۂ جاں جذبِ پنہانی کند
اندراں تکیہ کہ بروے رحمتِ بسیار باد | حالتے دیدم کہ پیدا رنجِ روحانی کند
از غلاظتہا کہ نا اہلاں دراں تکیہ کنند | دل نمی خواہد کہ آنجا فاتحہ خوانی کند
بر سرِ گورِ مسلماناں غلاظت کے رواست | ایں چنیں بے حرمتیہا خانہ ویرانی کند
دیو سیرت مرد مانند اندراں قرب وجوار | آں گروہِ کافراں ایں نامسلمانی کند
چشم میدارم کہ سرکار از رہِ لطفِ عمیم | منعِ ایں چنیں افعالِ شیطانی کند

آفتابِ دولت و اقبالِ تو تابندہ باد
خطۂ بھوپال را عدلِ تو نورانی کند

حسبِ توقع صفائی کا حکم ہوگیا اور آئندہ کے لئے بندوبست کردیا گیا۔

والد کو لکھنے سے ذوق نہ تھا۔ ایک رسالہ تصوف میں لکھا تھا جس کو میں نے پیسہ اخبار کے دفتر میں چھاپنے کے لئے دیدیا تھا۔ اس نے میری عدم موجودگی میں غلط فہمی سے اس کو میرے ہی نام سے شائع کردیا۔ ادھر چند سال ہوئے حکیم احمد حسین الہ آبادی اس کو چھاپنے کے لئے لے گئے میں نے تصحیح بھی کردی تھی، اس کے بعد ان کا انتقال ہوگیا اور مجھے معلوم نہ ہوا کہ اس کو شائع بھی کیا یا نہیں۔ بیعت کے متعلق بھی ایک مختصر تحریر والد کی تھی جس کو انھوں نے چھپایا تھا۔ اس کی چند کاپیاں مجھے بھیجدی تھیں۔

مطالعہ

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ مطالعے کی عادت میں نے ڈال لی تھی اور تحصیلِ علم میں اس کی اہمیت عملاً مجھے معلوم ہوچکی تھی۔ اس لئے ہمیشہ اس پر اس قدر سختی کے ساتھ مزاولت رکھی کہ کبھی بلا مطالعہ کئے سبق نہیں پڑھا۔ رات کو لغات و شروح سے مدد لے کر آنے والے سبق کو کوشش کے ساتھ حل کرتا تھا اور یہ سوچتا تھا کہ انھیں عبارتوں سے استاد مطلب سمجھ لیتے ہے پھر میں کیوں نہیں سمجھ سکتا۔ رفتہ رفتہ اس میں کامیاب ہوگیا، استاد بھی میری اس بات سے واقف تھے اس لئے سبق کے وقت زیادہ تر خارجی بحثیں کرتے تھے، تکرار میں میں اپنے ساتھیوں

کو پڑھاتا تھا اور میرے ہی بھروسے پر استاد کے سامنے سبق میں وہ خاموش بیٹھے رہتے تھے۔

مطالعے کی عادت نے مجھے اپنا استاد آپ بنا دیا تھا۔ دراصل میرے سبق پڑھنے کا وقت مدرسے میں نہیں تھا بلکہ رات کو تھا جبکہ میں اپنے کمرے کی خاموش تنہائی میں کتابیں لے کر غور کے ساتھ اپنے سبقوں کو حل کیا کرتا تھا۔ والد کی توجہ کا ہاتھ ہمیشہ میرے دل و دماغ کی نبض پر رہتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ مطالعہ کی یکسوئی میں خلل پڑنے سے مجھ کو تکلیف ہوتی ہے اس وجہ سے خود اس کا خیال رکھتے تھے۔ ایک بار میں نے دیکھا کہ عشاء کے بعد میری بہن جو مجھ سے بہت مانوس تھی اور جس کی عمر اس وقت ۵، ۶ سال کی تھی، میرے کمرے میں آرہی تھی۔ والد نے اس کو بلا کر اپنے پاس بٹھا لیا اور سمجھا دیا کہ رات کو کھانے کے بعد بھائی کے پاس مت آیا کرو۔ اگر کسی رات مطالعہ کا موقع نہیں ملتا تھا تو دن کو استاد سے کہہ دیتا تھا کہ آج سبق نہیں پڑھوں گا۔

درس

بھوپال میں اس زمانے میں عربی کے طلباء کی کثرت تھی اور الحمدللہ کہ میں ان میں مقبول تھا، اس لئے نہیں کہ میں مہتمم مدارس کا بیٹا تھا بلکہ اس لئے کہ خود مستعد اور ملنسار طالب علم تھا۔ میں ان سے محبت کرتا تھا وہ مجھ سے محبت کرتے تھے۔ اور بعض بعض میرے پاس پڑھنے کے لئے بھی آتے تھے اور میں ان کو پڑھاتا بھی تھا۔ والد بھی یہی چاہتے تھے۔ ایک بار انہوں نے ایک ولایتی طالب علم پیر محمد کو میرے سپرد کیا۔ میں ان کو پڑھانے لگا۔ قطبی میں نسبت حکمیہ کی بحث آئی، میں نے تقریر کی، وہ نہیں سمجھے۔ دوبارہ بیان کیا، ان کی سمجھ میں نہ آئی، تیسری بار سمجھانے کی پوری کوشش کی مگر پھر بھی وہ ہمہ تن سوال ہی بنے بیٹھے تھے اگرچہ ان کا سن بھی مجھ سے دگنا تھا اور قد بھی مگر میں نے تنگ آکر کتاب اُن کے سر سے ماری اور اُٹھ کر چلا آیا، لیکن دل میں سخت اضطراب پیدا ہوا۔ کیا اللہ کے خوف سے؟ نہیں، کیا اس وجہ سے کہ اخلاقی حدود توڑے تھے؟ نہیں، بلکہ صرف اس لئے کہ والد جب سنیں گے تو کیا کہیں گے، کیونکہ اس امر کی برداشت کی طاقت میں نہیں رکھتا تھا کہ میری کسی حرکت سے ان کے دل پر کلفت کا غبار آئے۔ سوچتا ہوا سیدھا انہیں کے پاس گیا اور کہا کہ میں ملا پیرو کو نہیں پڑھاؤں گا، بولے کہ کیوں؟ میں نے کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ اُن کے پڑھانے سے میں غبی ہو جاؤں گا

والد قیافہ شناس تھے، میرے چہرے پر نگاہ ڈالی، گھبراہٹ اور غصہ کے آثار دیکھے، کہنے لگے، اچھا
باؤ میں اُن کو کسی اور کے حوالے کر دوں گا۔ مصیبت اس وقت آتی تھی جب وہ کسی بنگالی طالب علم کو
یرے حوالے کرتے تھے کہ اس کو عربی پڑھاؤ۔ عربی مدارس کو جس قسم کے بنگالی طلبا میسر ہوتے ہیں
ن سے اکثر اساتذہ واقف ہیں۔ سال بھر میں بھی اگر میں اس کو سراجی پڑھا لیتا تھا تو اللہ کا شکر
دا کرتا تھا۔

کتب بینی

بعض بعض بحثوں میں میں نے دیکھا کہ توقیر مجھ سے بازی لے جاتے تھے، اس لئے نہیں کہ اُن
کا انتقالِ ذہنی مجھ سے تیز تھا یا وہ تقریر میں مجھ سے بہتر تھے بلکہ صرف اس لئے کہ ان کا مطالعہ
زیادہ وسیع تھا، چنانچہ میں نے بھی اس کمی کو پورا کرنے کے لئے کتب بینی شروع کی اور ابتدا میں
روزانہ کم سے کم سو صفحوں کی رفتار رکھی۔ کتب خانہ مفید عام جس کا ذخیرہ بڑھا کر اب بھوپال لائبریری
قائم کی گئی ہے اس زمانہ میں والد کی ماتحتی میں تھا، اس میں سے جس قدر کتابیں چاہتا لاکر پڑھتا، ادب
مذہب اور تاریخ سے والد کو ذوق تھا انھیں سے مجھ کو دلچسپی ہوئی۔

علامہ ابن تیمیہ اور ابن القیم کی جس قدر کتابیں اس وقت تک شائع ہوئی تھیں ان کا ذخیرہ
والد خود اپنی الماری میں رکھتے تھے۔ بحرین کے سب سے بڑے موتی کے تاجر شیخ مقبل جو اُن
دونوں بزرگوں کی کتابیں مصر سے شائع کراتے تھے والد کے دوست تھے، جو کتاب چھپواتے اس
کا ایک نسخہ ضرور بھیجتے۔ علی بن ماضی کی بدولت علمائے نجد کی کتابیں آتی رہتی تھیں، نواب صدیق حسن
خاں نے جس قدر کتابیں چھپوائی تھیں ان کا ہونا تو ہمارے پاس لازمی تھا۔ فتح الباری نیل الاوطار
اور فتح البیان کی کل جلدیں ایک ایک ورق دیکھ کر میں خود لایا تھا، اردو کی جدید تصنیفات اس
زمانے میں لکھنؤ، علی گڑھ اور لاہور سے جس قدر شائع ہوئی تھیں، ان سب کو میں نے منگایا۔ آخر
میں یہ سودا اس قدر بڑھ گیا کہ کتابیں پڑھنے سے سیری ہی نہیں ہوتی تھی اور مسبب الاسباب اس کا
سامان بھی کرتا رہا۔ لاہور گیا تو وہاں کی پبلک لائبریری کے علاوہ مولوی عبداللہ صاحب ٹونکی کی مہربانی
سے مستشار العلماء کا کتب خانہ میرے لئے وقف تھا۔ علی گڑھ کالج میں رہا تو مشرقی کتب خانہ خود
میری نگرانی میں تھا جو کتابیں اب تک نہیں مل سکی تھیں وہ یہاں ملیں۔ پڑھتا رہا اور پڑھتا رہا۔

خرمیں یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ پڑھنے، سمجھنے اور عمل کرنے کے لئے روئے زمین پر صرف ایک ہی کتاب ہے جو عرش سے اتری ہے اور جس کا نام قرآن ہے۔

چل سال رنج و غصہ کشیدیم و عاقبت
تدبیر ما بدست شراب دو سالہ بود

ملازمت

۱۹۰۳ء کے اواخر میں بھوپال سے پیسہ اخبار لاہور میں عربی کا مترجم ہو کر چلا گیا۔ وہاں دو سال رہا اور اخبار نویسی کا تجربہ حاصل کیا۔

۱۹۰۶ء میں علی گڑھ کالج میں آیا۔ یہاں کالجیٹ اسکول میں عربی اور فارسی کا مدرس ہوا۔ چھ سال کے بعد کالج کی لٹن لائبریری میں مشرقی کتب کا شعبہ میرے سپرد کیا گیا اور میں نے اس کی فہرست مرتب کی۔

کچھ زمانے کے بعد میں مدرسۃ العلوم (علی گڑھ) میں عربی اور فارسی کا پروفیسر مقرر ہو۔ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ ترک موالات کے سلسلہ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم ہوئی۔ مولانا محمد علی مرحوم کے اصرار سے میں اس میں چلا آیا اور تاریخ اسلام کا مضمون میرے سپرد ہوا۔ یہی سلسلہ آج تک چلا جاتا ہے۔

تصنیف

لکھنے کا شوق مجھے بچپن سے ہے۔ جب میری عمر ۱۲ سال کی تھی اس وقت فارسی قواعد میں ایک مختصر رسالہ فارسی زبان میں "قواعد اسلمیہ" کے نام سے لکھ کر بھوپال کے سرکاری مطبع سے شائع کرایا تھا، لیکن میری تصنیفی زندگی در اصل علی گڑھ کالج سے شروع ہوئی۔ سب سے پہلے وہاں میں نے ۱۳۲۵ھ [۸-۱۹۰۷ء] میں تاریخ القرآن لکھی جو اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ نیز علی گڑھ کالج میں دینیات کے نصاب میں داخل کی گئی اور عرصے تک رہی۔

۱۹۰۸ء میں خواجہ حافظ شیرازی کی لائف "حیات حافظ" لکھ کر علی گڑھ کالج سے شائع کی، یہ کتاب اس وقت بہت مقبول ہوئی۔ چنانچہ صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کی ایڈمنسٹریشن رپورٹ ۱۰-۱۹۰۹ء میں یہ اس سال کی جملہ اردو میں شائع شدہ کتابوں میں چوٹی کی کتاب تسلیم کی گئی۔ اس کے دوسرے

سال "دینیات جالی" سے بھی زیادہ مقبول ہوئی۔

فرائض حنفی یعنی فن وراثت میں مجھے بعض بنیادی غلطیاں نظر آئیں، میں نے اچھی طرح تحقیق کی، بالآخر غور و خوض کے بعد اس کی تمام اصولی غلطیاں میرے سامنے نمایاں ہوگئیں۔ چنانچہ میں نے "الوراثۃ فی الاسلام" کے نام سے عربی زبان میں ایک کتاب لکھی جس کو ٹائپ میں چھپوا کر شائع کیا، اس میں وہ تمام باتیں دلائل کے ساتھ واضح کیں جو اس فن کی تدوین میں قرآن کے خلاف واقع ہوئی ہیں۔

علی گڈھ کالج ہی میں میں نے تاریخ الامت لکھنے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ لیکن اس کی اشاعت اس وقت ہوئی جب میں جامعہ ملیہ میں آگیا۔ کئی سال میں اس کے سات حصے لکھے گئے۔ جس میں ابتدائے اسلام سے مصطفےٰ کمال مرحوم کے الغائے خلافت تک اسلام کی تاریخ آگئی۔ اس کی زبان سادہ رکھی اور طرز بیان آسان تاکہ ہر مسلمان طالب علم بلکہ ہر پڑھنے والا اس سے آسانی کے ساتھ فائدہ اٹھا سکے، چنانچہ بلا کسی کوشش اور سفارش کے مختلف حصے، مختلف یونیورسٹیوں اسلامی کالجوں اور اسکولوں کے نصاب میں داخل ہوگئے، خاص کر اس کی پہلی جلد (سیرۃ الرسول) بیشتر اسلامی اسکولوں کے نصاب میں ہندستان کے طول و عرض میں لے لی گئی، یہی کتاب ہے جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ سے عام دلچسپی پیدا کرائی، بالخصوص مسلمان طلبار میں۔

دینیات کے نصاب کے لئے دو مختصر رسالے مسلمان طلبار کے لئے لکھے۔ ایک عقائد میں "عقائد اسلام"، کے نام سے۔ دوسرا شریعت میں "ارکان اسلام"۔ ان کو ایسے آسان جدید اور دلچسپ ڈھنگ سے لکھا کہ بہت مقبول ہوئے اور مختلف مقامات پر دینیات کے نصاب میں شامل کئے گئے۔

اسی طرح قومی، ملی اور تاریخی نظمیں جو میں نے مختلف موقعوں پر لکھی تھیں ان میں سے دس نظموں کا مجموعہ "جواہر ملیہ" کے نام سے جامعہ ملیہ نے چھاپ کر اردو ادب کے نصاب تعلیم میں داخل کیا ہے۔

جب اہل نجد کا ۱۹۲۴ء میں ظہور اور غلبہ ہوا اور وہ حرم مکہ پر قابض ہوگئے اور شریف حسین کو وہاں سے نکالا اس وقت ان کی تاریخ کی ہندستان کے ہر گوشے سے مانگ ہوئی،

ہوں نے لوگوں کے حسبِ طلب "تاریخ نجد" لکھی۔ بہت سی غلط فہمیاں جو ہندوستان کے مسلمانوں میں نجدیوں کی بابت تھیں اس کتاب سے رفع ہوگئیں۔

اس سے پہلے فاتح مصر حضرت عمرو بن العاصؓ کی مفصل سیرت لکھی تھی۔ آخر میں تعلیمات قرآن لکھی جس میں اصول و عقائدِ اسلام کی خود اسی کی آیات سے تفصیل کی اور یہ ثابت کردیا کہ قرآنِ کریم اسلام کی مستقل اور مکمل کتاب ہے اور وہ اپنی تفسیر آپ کرتا ہے۔

علماءِ اہلحدیث

یوں تو کون سا دن ناغہ جاتا تھا جس میں ہمارے یہاں کوئی مولوی یا عالم نہ آتا ہو مگر میں صرف انھیں حضرات کا ذکر کروں گا جو علم و فضل میں نمایاں شہرت رکھتے تھے اور اپنے زمانے میں ممتاز تھے۔

نواب صدیق حسن خاں صاحب

میں جب بھوپال آیا ہوں اس وقت نواب صاحب زندہ اور خطاب و سلامی کے انتزاع کے بعد سے ہمہ تن علمی اور دینی شغل میں مصروف تھے۔ شہر میں ان کی بدولت علوم دینیہ بالخصوص حدیث کا بہت چرچا تھا۔ انھوں نے اندھوں کے لئے وظائف مقرر کئے تھے تاکہ وہ قرآن اور ہوسکے تو حدیث بھی حفظ کریں۔ چنانچہ اس زمانے میں بھوپال کے اکثر نابینا حافظ تھے۔ یہاں تک کہ وہاں اندھوں کو بالعموم حافظ جی کہتے تھے اور بہت سے ایسے بھی تھے جنھوں نے قرآن کے ساتھ بلوغ المرام یا مشکوٰۃ بھی یاد کر رکھی تھی۔

کتبِ حدیث مثلاً فتح الباری اور نیل الاوطار وغیرہ نیز اپنی تصنیفات کی اشاعت میں وہ بے دریغ روپے صرف کرتے تھے اور ان کو اکثر مفت تقسیم کراتے تھے۔ انھوں نے اپنی جاگیر میں سے پانسو روپیہ ماہوار شاہجہاں بیگم کے نفقۂ زوجیت کے لئے منظور کئے تھے لیکن وہ اس کی محتاج نہ تھیں اس وجہ سے اس رقم کو کتاب و سنت کی اشاعت میں صرف کرتی تھیں اور اُن علماء کو وظیفہ دیتی تھیں جو اقطاعِ ہند میں جابجا حدیث پڑھاتے یا مقلدوں سے مناظرے کرتے تھے۔ یہ سلسلہ نواب صاحب کے انتقال کے بعد بھی ۱۳۱۹ھ [۱۹۰۱ - ۲ء] تک جاری رہا۔ جب تک کہ بیگم صاحبہ زندہ

رہیں ۔ اس کے علاوہ بھی بیگم صاحبہ نے اپنی فیاضی سے علماء کی تنخواہیں اور طلباء کے لئے مختلف قسم کے وظائف اور گزارے مقرر کر رکھے تھے جن کی بدولت لوگ فارغ البالی کے ساتھ پڑھتے پڑھاتے تھے۔

۱۳۰۷ھ [۸۹ ـ ۱۸۸۸ء] میں بقرعید کے دن جب والد نواب صاحب سے ملنے گئے میں بھی ساتھ تھا ۔ تاج محل کے صدر دروازے کے اوپر والے کمرے میں بیٹھے تھے ۔ ان سے زیادہ حسین بڈھا آج تک میری آنکھوں نے نہیں دیکھا ۔ کبھی میں اُن کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی باہر دروازے کے سامنے، جہاں اونٹ نحر کیئے جا رہے تھے اور جو میرے لئے ایک نیا اور دلچسپ نظارہ تھا ۔ انھوں نے ایک رکوع مجھ سے پڑھوایا اور سُن کر خوش ہوئے ۔

واپسی میں میں نے والد سے کہا کہ نواب صاحب، تو مرد ہیں پھر گلے میں موتیوں کی مالا کیوں پہن رکھی ہے ۔ کہنے لگے کہ مالا نہیں بلکہ تسبیح ہے ۔ میں نے کہا تو کیا یہ اہلِ حدیث کے نزدیک بدعت نہیں ہے ؟ بولے کہ کیوں نہیں، مگر انھوں نے عید کی وجہ سے گلے میں ڈال لی ہوگی پڑھنے کے لئے نہیں ۔

دوسرے سال رجب میں اُن کا انتقال ہوگیا ۔

مولوی ذوالفقار احمد صاحب

تصنیف کے سیغے میں نواب صاحب کے رفیق تھے، قد چھوٹا تھا اور رنگ سانولا، مگر نیکی اور خوش خلقی کا مجسمہ تھے، عربی جس قدر پختہ لکھتے تھے اردو اسی قدر خام ۔ والد کے ساتھ مخلصانہ محبت رکھتے تھے اور کبھی کبھی ملنے کے لئے آتے ۔ ۱۹۱۷ء میں بھوپال گیا تھا تو زندہ تھے، مجھے دیکھ کر والد کو یاد کر کے بہت روئے، زہد و عبادت کے علاوہ ان میں تواضع کی صفت ایسی تھی جو ہر انسان پر اثر ڈالتی تھی ۔

شیخ حسین عرب

یمنی انصاری، حدیث کے مسلّم استاد، نواب صدیق حسن خاں نے بھی انھیں سے حدیث پڑھی تھی ۔ اُن کا مشغلہ رات دن حدیث تھا، پڑھنا اور پڑھانا، کوئی حدیث ایسی نہ تھی جس کو یہ نہ جانتے ہوں یا اُس کے طرقِ روایت سے واقف نہ ہوں ۔ کتبِ حدیث کا بڑا ذخیرہ اپنے پاس رکھتے تھے، اُن کا مکان ہم سے قریب تھا، اکثر آتے رہتے تھے، نہایت بے تکلف، مخلص اور زندہ دل ۔ ان کو معلوم تھا کہ نیچے

کا مکان مردانہ ہے مگر جب آتے اسلامی دستور کے مطابق اجازت کے لئے کنڈی کھٹکھٹاتے۔ میں پوچھتا کون ہ کہتے بدّو ۔۔۔۔ فوراً لپک کر استقبال کے لئے بڑھتا اور سلام کرتا، جواب میں فرماتے اسلم سالمہ اللہ۔

ان کا لباس اور ان کی گفتگو سب عربی تھی، مدت ہائے دراز تک بھوپال میں رہنے کے بعد بھی اردو کم سیکھی تھی، اس کو بھی عربی لہجے میں بولتے تھے۔

لطیفہ

ایک دفعہ دہلی سے میاں صاحب کے پوتے مولوی عبدالسلام صاحب بھوپال میں آئے تھے۔ والد نے شام کے وقت مجھ سے کہا کہ جا کر شیخ صاحب کے یہاں سے اُن کو ساتھ لاؤ۔ میں گیا دیکھا کہ شیخ صاحب اکیلے اپنی بیٹھک میں ہیں۔ پوچھا کہ مولوی عبدالسلام کہاں ہیں؟ بولے۔ فل فر۔ میں نہیں سمجھ سکا۔ پھر کہا۔ فل فر۔ اب بھی سمجھ میں نہ آیا۔ پھر انھوں نے اسی کو دہرایا۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ باللہ یا شیخ قل بالعربیہ۔ بولے۔ علی الجسر (پل پر) یہ سُن کر میں ہنستا ہوا پل کی طرف گیا جو اُن کے مکان سے ایک فرلانگ سے زیادہ دور نہیں ہے اور جہاں مخلوق کھڑی ہوئی تال کے سیلاب کا تماشہ دیکھ رہی تھی، مولوی صاحب وہاں ملے، اُن کو یہ لطیفہ سنایا اور اپنے ساتھ لایا۔

ایک بار والد کی آنت میں تکلیف لاحق ہوئی۔ ایک حکیم صاحب نے جو ہمارے گھر کے معالج تھے، منضج پلایا۔ پھر املتاس کا بڑا مسہل دیا لیکن کوئی اجابت نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ یکے بعد دیگرے تین مسہل دئے اور سب ہضم۔ گرمی کی وجہ سے دماغ بے چین رہنے لگا اور نیند نہیں آتی تھی۔ تین ہفتوں سے زیادہ اسی حالت میں گزر گئے، پلنگ پر پڑے پڑے پشت اور پہلو کی کھال اُدھڑنے لگی، آنکھیں حلقوں میں گھس گئیں اور غذا نہ ہونے کی وجہ سے سخت کمزوری آ گئی۔ ایک دن صبح کو شیخ صاحب آئے۔ والد کے پاس جا کر ان کی حالت دیکھی تو پلنگ کے پاس بیٹھ گئے اور اپنا سر اُن کی بغل میں ڈال کر رونے لگے۔ والد کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے۔ یہ دیکھ کر میرا دل بھر آیا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد گیا، شیخ صاحب نے پوچھا دوا پلائی ہے؟ میں نے کہا کہ ابھی نہیں اور میرا خیال تو یہ ہے کہ حکیم کی دوا سے کوئی فائدہ نظر نہیں آتا ڈاکٹر کا علاج ہونا چاہئے۔ شیخ صاحب نے کہا بلشک علاج بدلنا چاہئے۔ والد بھی ان کے کہنے سے راضی ہو گئے

ورنہ وہ ڈاکٹری علاج کو پسند نہیں کرتے تھے۔

میں اسی وقت ڈاکٹر ولی محمد کے پاس گیا جو سلطان جہاں بیگم ولی عہد کے معالج تھے جن کا محل ہم سے بہت قریب تھا۔ ڈاکٹر صاحب فوراً آئے۔ انھوں نے اچھی طرح دیکھا پھر مجھے ساتھ لے کر چلے۔ راستہ میں کہنے لگے کہ جب حکیم نے مار ڈالا اس وقت مجھے اطلاع دی۔ منضج پر منضج، مسہل پر مسہل اور بیماری کی خبر ہی نہیں۔ میں نے پوچھا کیا بیماری ہے؟ کہنے لگے کہ آنت میں غدود ہے جب تک وہ نہیں ٹوٹے گا کچھ معدے سے خارج نہ ہوسکے گا۔ انھوں نے پارے کا مرہم دیا کہ اس کو شکم پر ملو۔ اور بلاڈونا، کہ اس کو پانی میں اُبال کر فلالین کے ٹکڑوں کو تر کر کے سنکائی کرو۔ یہی میں نے کیا۔ گھنٹہ بھر کے بعد ہی جو کی لگائی گئی، معدہ بالکل صاف ہوگیا اور مرض جاتا رہا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ شفائے عاجل شیخ صاحب کی مخلصانہ دعا کا نتیجہ ہے۔

شاہجہاں بیگم صاحبہ جب مرض الموت میں گرفتار ہوئیں تو اُن کی شفا کے لئے شیخ صاحب نے بخاری کا ختم تجویز کیا جو انھیں کے مکان پر شروع کیا گیا۔ ہر مہینے ختم خوانوں کے لئے جو روپیہ آتا تھا اس میں سے والد کا حصہ جو منتظمین میں سے تھے میں جا کر لاتا تھا اچھی خاصی رقم مل جاتی تھی۔ عام اہلحدیث کی طرح اس وقت میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ یہ مال طیب اور حلال ہے۔

بیگم صاحبہ کی علالت نے زیادہ طول کھینچا اور اس ختم کا سلسلہ تقریباً سال بھر جاری رہا۔ پڑھنے والے بہت خوش تھے۔ اس تمام مدت میں صرف ایک دن میں نے ان کو افسردہ خاطر دیکھا جس دن کہ انھوں نے یہ سنا تھا کہ فلاں پیر صاحب کو بیگم نے بیس ہزار روپے بھیجے ہیں۔

شیخ صاحب کے چھ بیٹے تھے۔ سب سے بڑے شیخ محمد عرب تھے جو والد کے خاص انیس و جلیس تھے۔ وہ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں سے کم سے کم چھ گھنٹے روزانہ والد ہی کے پاس گزارتے تھے۔ آخر میں دارالعلوم ندوہ میں ادیب ہوکر چلے گئے تھے۔

ہمارا تعلق اس خاندان کے ساتھ تھا بحمد اللہ کہ اب تک باقی ہے اور شیخ محمد کے بیٹے شیخ خلیل عرب جو لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہیں[۱۸] مجھے اسی قدر عزیز ہیں جس قدر اُن کے والد میرے والد کو عزیز تھے۔

مولوی محمد بشیر صاحب سہسوانی

علم وفضل میں وحید عصر تھے۔ والد فرمایا کرتے تھے کہ "مولوی محمد بشیر صاحب کی قوت مطالعہ بے مثل ہے۔ عبارات و اشارات کا صحیح مفہوم سمجھنے والا ان سے بہتر میں نے کسی کو نہیں پایا۔" نواب صدیق حسن خاں مدرسہ سلیمانیہ کی مہتممی سے جب میر دبیر کے عہدے پر گئے تو ان کی جگہ یہ مہتمم مدرسہ ہوئے مگر ان کو انتظامی امور سے دلچسپی نہ تھی اس لئے شاہجہاں بیگم نے جو بڑی مردم شناس تھیں، ان کی تنخواہ مناصب میں منتقل کر دی اور خدمات مہتممی والد کے سپرد کر کے ان کو سبکدوش کر دیا۔ ہر دوشنبہ کو تاج محل میں بلا کر ان کا وعظ سنا کرتی تھیں۔ مناظرے میں بے نظیر تھے۔ حج کے لئے گئے وہاں شیخ دحلان سے مقابلہ ہوا اس کے رد میں صیانة الانسان[۱۹] ایسی کتاب لکھی کہ وہ جواب نہ دے سکا۔ عربی نہایت عمدہ لکھتے تھے۔ ایک بار میرے ساتھیوں میں سے ایک شخص ان کے یہاں سے میر زاہد رسالہ عاریۃً پڑھنے کے لئے لائے، ان میں مولانا عبدالحی لکھنوی[۲۰] کا ایک خط ملا جو اُن کے نام تھا۔ باوجود اس کے کہ اس وقت مولانا عبدالحی ان کے ساتھ اس مسئلے کے خلاف رسالہ بازی کر رہے تھے کہ حج میں مدینہ کی زیارت لازم نہیں ہے پھر بھی اس طرح ان کو خطاب کیا تھا جیسے کوئی شاگرد اپنے استاد کو لکھتا ہے اور ان کی عربیت کی فوقیت کو تسلیم کیا تھا۔

مرزا غلام احمد قادیانی جب دہلی میں میاں صاحب سے بحث کرنے آئے تھے اس وقت ان کے مشورہ سے یہی مقابلے کے لئے بھوپال سے بلائے گئے تھے۔ ان کی تقریر جذبات سے خالی اور دلائل سے لبریز ہوتی تھی۔ ہمارے محل کے سامنے ہیرا مسجد ہے، اس میں ہر جمعہ کو وعظ فرماتے تھے۔ کبھی کبھی میں بھی سننے کو چلا جاتا تھا۔ سامعین کی تعداد تھوڑی ہوتی تھی، وعظ کیا کہتے تھے اچھا خاصا سبق پڑھاتے تھے۔

یہ ہم سے فاصلے پر رہتے تھے لیکن تاہم مہینے میں ایک دو بار ضرور والد کے پاس آتے تھے، میں ان کی بڑی تکریم کرتا تھا اور مجھ پر شفقت بھی بہت فرماتے تھے۔ تقویٰ اور عبادت میں ان کا درجہ بلند تھا، مگر دنیا میں رہنے کا ڈھنگ نہیں جانتے تھے۔ کبھی کبھی بے تدبیر مصاحبوں کے اغوا سے بے قرینہ شادیاں کر بیٹھتے تھے جو نہ صرف ان کے لئے بلکہ ان کے خیر خواہوں کے لئے بھی پریشانی کا موجب ہوتی تھیں۔ اکثر والد کو یہ جھگڑے سلجھانے پڑتے تھے۔

ان کی بیٹی کو بیاہنے کے لیئے سہسوان کے ایک معزز اور دولتمند رئیس آئے۔ جماعت اہل حدیث میں اس شادی کی بڑی دھوم تھی۔ میں بھی والد کے ساتھ مدارالمہام صاحب کی مسجد میں گیا جہاں نکاح تھا مجھے تعجب ہوا کہ مہر پچاس ہزار اشرفی مقرر کیا گیا۔

واپسی میں جب ہم سوار ہوئے تو میں نے والد سے کہا کہ اس قدر مہر تو سنت کے خلاف ہے۔ ہماری مسجد کے موذن حاجی نعمت اللہ پرتاپ گڈھی بھی ساتھ تھے جنھوں نے اجودھیا کے جہاد میں مولوی امیر علی کا ساتھ دیا تھا متقی، مجاہد اور سوائے اللہ کے کسی سے نہ ڈرنے والے۔ میری بات سن کر بولے کہ "مولویوں کا حال مجھ سے سنو۔ یہی مولوی محمد بشیر اور قاضی شیخ محمد اور فلاں و فلاں ہماری مسجد میں ایک دن بیٹھے ہوئے گفتگو کر رہے تھے۔ مسئلہ یہ طے ہوا کہ خانۂ خدا میں سوائے اللہ کے کسی کی تعظیم کے لیئے کھڑا ہونا جائز نہیں ہے۔ اسی درمیان میں نواب صدیق حسن خاں آ گئے جو اس وقت شیش محل میں رہتے تھے اور جماعت اسی مسجد میں پڑھتے تھے۔ یہ سارے مولوی ان کی تعظیم کے لیئے کھڑے ہو گئے۔ صرف میں بیٹھا ہوا تھا اور ہنس رہا تھا۔ نواب صاحب نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ میں نے سارا قصہ سنایا، وہ بھی ہنس پڑے۔ یہ مولوی ہم کو تو حدیث سناتے ہیں کہ جس عورت کا مہر کم ہو وہ برکت والی ہوتی ہے اور خود اپنی بیٹیوں کا مہر بندھواتے ہیں پچاس ہزار دینار سُرخ۔"

ایک بار رمضان میں ایک شاہ صاحب جو کمبل پوش کے لقب سے مشہور تھے۔ بھوپال میں آ کر مولوی صاحب کے یہاں ٹھہرے۔ وہ صاحب علم تو نہ تھے مگر خوش بیان واعظ تھے۔ اُن کی باتوں میں آ کر مولوی صاحب ان کے مرید ہو گئے یہاں تک کہ ان کے ہاتھ پر بیعت بھی کر لی۔ والد کو یہ بات بہت ناگوار گزری، جا کر اُن کو سمجھایا کہ جس چیز کو ہم ہٹانے کی کوشش کر رہے ہیں اس کو جب ہماری ہی جماعت کے علماء خود اختیار کریں گے تو کامیابی کیونکر ہوگی۔ انھوں نے نہیں سُنا بلکہ آخر رمضان میں ایک اشتہار بھی شائع کیا کہ اب کے شاہ کمبل پوش کی معیت میں دعا و عبادت و ذکر و شغل میں وہ لطف آیا جو اس سے پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ والد نے تمام جماعت اہل حدیث کو بلا کر کہہ دیا کہ جب تک مولوی صاحب اس بیعت سے رجوع نہ کریں اس وقت تک ان کے ساتھ سلام و کلام ترک کر دو۔ اتفاق ایسا ہوا کہ عید کے بعد کمبل پوش ایک

حسین لڑکے کو لیکر بھاگ گئے ۔ اب مولوی صاحب کو فسخ بیعت کا اعلان کرنا پڑا ۔ والد نے سنا تو فوراً مجھے بھیجا کہ ان کو معہ ان کے حواریوں کے آج کی دعوت دے آؤ ۔ دوسرے دن انھوں نے ہم کو بلایا مگر ان دونوں موقعوں پر نہ شاہ صاحب کا ذکر درمیان میں آیا نہ بیعت اور فسخ بیعت کا ۔ میں سمجھ گیا کہ جو بات فیما بین ملال کا موجب ہوئی تھی اس کے ذکر کو بھی یہ حضرات جفا خیال کرتے ہیں ۔

یہ لڑکا میرے پاس بھی آیا کرتا تھا، سپاہی زادہ تھا اور بے علم مگر نہایت شائستہ اور جامہ زیب ۔ شکل کے لحاظ سے زیادہ خوبصورت نہ تھا لیکن نقاش قدرت نے ندرت کاری سے اس کی ہلالی پیشانی کے نیچے نسوانی آنکھیں لگا دی تھیں جن میں طلسمات کے کارخانے تھے اور جادو ڈھلتا تھا اسی سحر بابل میں کمبل پوش گرفتار ہو گیا ۔

ایک مدت کے بعد جبکہ میں علی گڈھ کالج میں پروفیسر تھا کمبل پوش ایک دن مولانا عبداللہ صاحب ناظم دینیات کے حجرے میں نظر آئے ۔ مجھ کو پہچان لیا، اٹھ کر بغل گیر ہوئے ۔ میں نے ٹھہرانا چاہا، کہنے لگے کہ مجھے ابھی حیدر آباد سندھ کو روانہ ہونا ہے، وہاں کے ایک دولتمند زرگر نے بلایا ہے، جس کے نوجوان بیٹے کے سر پر جن آتا ہے ۔ اس کا تار بھی مجھ کو دکھایا ۔ میں نے دل میں کہا سبحان اللہ ۔

مَا أَشْبَهَ اللَّيْلَةَ بِالْبَارِحَةِ

مولوی محمد بشیر صاحب نے اپنے مکان پر مقارنہ کی بنیاد ڈالی یعنی حفاظ اور قرار کا اجتماع کر کے ایک ایک رکوع پڑھواتے ۔ اس زمانے میں شہر بھوپال میں قرآن خوانی کا بڑا چرچا تھا ۔ اس کے ۶۶ ہزار باشندوں میں سے جن میں ہر قوم و ملت کے لوگ شامل تھے کم و بیش چھ ہزار مسلمان زن و مرد حافظ شمار کئے گئے ۔ بہت سے پورے گھر کے گھر حافظ تھے ۔ اصول تجوید کے مطابق پڑھنے والے اچھے اچھے قاری بھی تھے ۔ مثلاً قاری سلیمان، قاری عبدالہادی وغیرہ جو دور دور تک مشہور تھے ۔ اس محفل میں عوام کے علاوہ امراء و رؤسا بھی شریک ہونے لگے ۔ ایک بار ملک شام کے یک نامور قاری آئے ہوئے تھے ۔ اس وقت جلسہ کے لئے پری گھاٹ میں ایک جاگیردار کا بڑا محل خالی کرایا گیا تھا ۔ شامی صاحب کی عمر تقریباً ساٹھ سال تھی مگر جوانوں سے زیادہ توانا و تندرست تھے اور رنگ سرخ و سفید ۔ کلیجے کے زور پر پڑھتے تھے ۔ سورۃ یٰسین شروع کی نصف

تک پہنچتے پہنچتے ایسا معلوم ہونے لگا کہ اب ان کا جگر شق ہو جائے گا یا چہرہ سے خون چھلکنے لگے گا۔ بارے وہیں ختم کر دیا مجھے یہ ناگوار قرأت سُن کر سخت کوفت ہوئی۔

بالآخر ایک دن والد نے مولوی صاحب کو سمجھایا کہ اکثر مذہبی رسمیں شروع میں معصوم نظر آتی ہیں مگر جب جڑ پکڑ لیتی ہیں تو ان کا مٹانا محال ہو جاتا ہے۔ مقارنہ میں بھی مولود کی طرح عالمگیر ہو جانے کی صلاحیت ہے لہذا ابھی سے اس کا روکنا مناسب ہے۔ مولوی صاحب نے اس کی بات مان لی اور پھر اس کی محفل نہیں منعقد کی۔

مولوی محمد احسن صاحب امروہوی

بھوپال میں محکمۂ مصارف کے بخشی تھے جو بالکل ہمارے محل سے متصل تھا۔ کبھی کبھی شام کو جب وہ اپنی کچہری سے نکلتے اور میں باہر ہوتا تو ان کو سلام کرتا۔ وہ صرف جواب دینے پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ قریب آ کر گھر بھر کی خیریت پوچھتے۔ کبھی میری پڑھائی کا حال دریافت کرتے۔ کبھی کوئی مختصر قصہ یا نصیحت سناتے۔ ان کی صورت سے نیکی ٹپکتی تھی۔ بڑے مناظر مشہور تھے۔

جب اُن کے قادیانی ہونے کی خبر پھیلی اس زمانے میں ایک دن والد کے پاس مدرسہ سلیمانیہ میں کسی کام سے آئے۔ وہاں کئی مولوی بھی بیٹھے تھے۔ ایک نے سوال کیا کہ آپ نے کس دلیل سے مرزا کو مسیح موعود مانا۔ مولوی صاحب جلدی یا گھبراہٹ میں بے سوچے بول اٹھے کہ ایک میں کیا ہزاروں ہیں جو اُن کو ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ اس نے کہا کہ اگر یہی دلیل ہے تو حضرت عیسیٰؑ کے ابن اللہ ہونے سے آپ کیوں انکار کرتے ہیں کیوں کہ کروڑوں ہیں جو اُن کو ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ مولوی صاحب ایسے شکنجے میں پھنس گئے کہ کچھ بس نہ چلا۔ جھنجھلائے۔ چہرہ سُرخ ہو گیا۔ گردن کی رگیں پھول آئیں۔ والد نے یہ کیفیت دیکھی تو فوراً بحث کو روک دیا۔ مجھے مولوی صاحب کی حالت پر اس وقت بڑا ترس آیا۔

مولوی ابراہیم صاحب آروی

آرہ کے رئیس تھے اور علمائے اہل حدیث میں ممتاز علم کے لحاظ سے بھی اور جسم کے لحاظ سے بھی۔ غالباً ۱۳۰۹ھ [۱۸۹۱-۹۲ء] میں رمضان کے مہینے میں بھوپال تشریف لائے تھے۔

فظ عبداللہ صاحب غازی پوری بھی ساتھ تھے۔ یہ دونوں حضرات جماعت اہلِ حدیث کے شمس و
رخیال کئے جاتے تھے۔ ہمارے اور مولوی محمد لشبیر صاحب کے مکان کے وسط میں ریتی گھاٹ پر
شیخ حسین صاحب عرب کی مسجد میں عشرۂ اخیرہ میں تہجد باجماعت کا بندوبست کیا گیا تاکہ سب
ہاں جمع ہوسکیں۔ اکثر علماء وطلباء آکر شریک ہوتے تھے۔ ایک رات میں بھی والد کے ساتھ
یا۔ حافظ عبداللہ صاحب پیش نماز تھے۔ ہر ہر رکوع میں ایک ایک دو دو لقمے لیتے تھے۔ گھر میں
کر میں نے والد سے کہا کہ حافظ صاحب اتنے بڑے عالم ہوکر اس قدر بھولتے کیوں ہیں۔ کہنے
ے کہ ان کی توجہ الفاظ سے زیادہ معانی کی طرف رہتی ہے۔

مولانا ابراہیم صاحب کا وعظ ہندوستان بھر میں مشہور تھا۔ جمعہ کے دن جامع مسجد میں
ن کے وعظ کا اعلان کرایا گیا۔ ہم سب لوگ مع مولانائے موصوف کے اپنی مسجد میں جمعہ کی نماز
ھ کر جامع مسجد گئے۔ بے اندازہ مجمع تھا۔ وسطِ مسجد میں کھڑے ہوکر وعظ فرمایا۔ چونکہ شکل و
صورت میں والد سے مشابہ تھے اس لئے شہر میں یہی مشہور ہوا کہ مولانا کے بڑے بھائی کا
عظ تھا۔

حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری

مشرقی ہند میں حدیث میں امام اور جملہ علوم متداولہ میں کامل تسلیم کئے جاتے تھے۔ بھوپال
ں کئی بار تشریف لائے۔ والد جب وطن جاتے تو وہ ملاقات کے لئے غازی پور سے دو ایک روز
ے لئے جیراجپور ضرور آتے۔ ان کی سادگی، کم سخنی، نرم زبانی اور اذان سننے کے ساتھ
مسجد میں آنے کی پابندی کی باتیں مجھے یاد ہیں۔ آخری بار علی گڑھ میں ملاقات ہوئی تھی۔
ں وقت عربی مدارس اور ان کے نصاب سے بہت مایوس نظر آئے۔

مولوی عبدالوہاب صاحب بہاری

علومِ عقلیہ کے مسلّم استاد اور میدانِ مناظرہ کے شہسوار تھے۔ ان کی طبیعت ادیبانہ تھی
ر مزاج میں ظرافت، اس وجہ سے کبھی بحث میں ان کو غصہ نہیں آتا تھا۔ مجھ کو دیگر علماء
ِ حدیث کی بہ نسبت اُن سے زیادہ دلچسپی ہوئی۔ نہایت خوش گپ تھے اور اپنے سامنے کسی
بولنے نہیں دیتے تھے کسی بات پر کوئی ٹوک دیتا تو پوری منطق ستہ) بلا میں صرف کرتے اور آخر

سنوا کر چھوڑتے پھر بھی دلیلوں کا سلسلہ نہیں ٹوٹتا تھا۔ سانڈ کی حلت کے قائل تھے۔ انھیں کے طلبار میں سے توقیر الحسن ہم کو ملے ۔

قاضی شیخ محمد صاحب جعفری

مچھلی شہر ضلع جونپور کے بڑے نامی خاندان سے تھے جس میں علم موروثی تھا۔ کسی زمانے میں بھوپال میں قاضی تھے اور اسی محل میں رہتے تھے جس میں ہماری سکونت تھی۔ انھیں کے نام سے ہماری مسجد قاضی جی کی مسجد بولی جاتی تھی۔ تقوے میں بزرگانِ سلف کا نمونہ سمجھے جاتے تھے۔ بڑھاپا، اس پر عوارض کی کثرت۔ پھر غذا برائے نام رہ گئی تھی لگر کیا ممکن جو جماعت ترک ہو جائے۔ ایک بار سخت نقاہت تھی میرا سہارا لیکر اٹھے۔ صحن مسجد میں پہنچکر بدن کانپنے لگا۔ آگے بڑھنے کی طاقت نہ دیکھی اور وہیں سے امام کے پیچھے نیت باندھ لی۔

پہلی بار جب وہ والد کے پاس ٹھہرے تھے اس وقت ہم وطن میں تھے۔ جس روز آئے تو والد نے صبح کو ہم سے کہا کہ قاضی صاحب اوپر کے کمرے میں ہیں وہ ابھی یہاں آئیں گے تم لوگ خاموش رہنا اور سوائے سلام کے کچھ نہ بولنا۔ میں ان سے حدیث مسلسل بالاوّلیۃ کی فرمائش کروں گا وہ تم کو سنادیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جن جن طلبار نے سنا تھا سب کو انھوں نے سندیں دیں مگر مجھ کو نہیں دی، اور فرمایا کہ تمھارا پائجامہ شرعی حد سے زیادہ نیچا ہے۔

اس زمانے میں ایک طالب علم میرے ضلع کا ابراہیم پورہ کی مسجد میں رہا کرتا تھا جو بارہ سال تک طالب العلمی کرنے کے بعد بھی صرف میر اور نحو میر ختم نہیں کر سکا تھا۔ میں نے اس کو بیکار دیکھ کر خدمت کے لئے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ وہ بھی ایک دن خوش خوش آیا اور کہنے لگا کہ قاضی صاحب نے مجھ کو مسلسل بالاوّلیۃ کی سند دیدی۔ میں نے ہنس کر کہا کہ تجھ کو سند نہیں ملی ہے بلکہ تیرے پائجامہ کو ملی ہے۔

حدیث و رجال حدیث کے متعلق ان کا علم بہت وسیع تھا۔ ہم لوگ جب کبھی ان کے پاس بیٹھتے سوائے حدثنا و اخبرنا کے کوئی دنیاوی بات کم کرتے تھے۔

مولوی محمد سعید صاحب بنارسی

یہ اپنی ذات سے مسلمان ہوئے تھے اور دینی علوم سے اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ بنارس کے

محلہ دارانگر میں سکونت اختیار کرلی تھی ۔ حدیث پڑھاتے بھی تھے اور اس کی اشاعت بھی کرتے تھے ۔
میں نے ایسا پرہیزگار مولوی کم دیکھا ۔ صورت بھی فرشتوں کی اور سیرت بھی فرشتوں کی ۔ جب یہ
بھوپال آتے تھے تو میرا دل بہت خوش ہوتا تھا ۔ میں لڑکپن سے ہر دوسرے سال اپنی خالہ کو
دیکھنے کے لئے بنارس جایا کرتا ہوں ۔ جب تک مولوی صاحب زندہ رہے ان کی خدمت
میں ضرور حاضر ہوتا ۔ وہ کوئی عذر قبول نہیں کرتے تھے اور بلا دعوت کھلائے راضی نہیں ہوتے
تھے ۔ ان کے کئی بیٹے صاحب علم و فضل ہیں جن میں سے مولوی ابو القاسم صاحب تصنیف اہل حدیث
میں نمایاں شہرت رکھتے ہیں ۔

مولوی محمد علی صاحب

مئو ضلع اعظم گڈھ کے رہنے والے ذی لیاقت اور زبردست مناظر تھے ۔ شوق نیموی
کے نہایت عمدہ جوابات لکھے اور متعدد مقلد مولویوں کے مقابلے کئے ۔ دبلے ، سیاہ فام مگر
ذہانت کے پتلے ۔ تقریر بھی چست تھی اور تحریر بھی ۔ کبھی کبھی بھوپال آیا کرتے تھے ۔ ایک بار
اُن کو بارہ سو روپیہ ملے ۔ لاکر صندوق میں رکھا ۔ ان کا پلنگ میرے کمرے کے متصل برآمدے میں
تھا جس کے سامنے ایک حجرہ تھا ۔ اس میں دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تپائیاں تھیں جن پر کتابیں
اور کپڑے رکھے ہوئے تھے ۔ بیچ میں ایک چھینکا لٹکا ہوا تھا جس پر گھی کی ہانڈی تھی ۔ مولوی صاحب
نے حفاظت کی غرض سے اپنا صندوق اسی حجرہ میں تپائی پرلے جاکر رکھا اور اس کا دروازہ
مقفل کر دیا ۔ اتفاقاً رات کو چھینکے کی بوسیدہ رسی ٹوٹ گئی اور ہانڈی نیچے گری ۔ مولوی صاحب
اس کی آواز سے چونک پڑے ۔ فوراً جاکر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئے ۔ میں نے بھی لالٹین
جلائی ۔ وہاں گیا دیکھا صندوق کو پکڑے ہوئے تپائی پر بیٹھے ہیں اور دونوں پاؤں گھی میں بھرے ہوئے
ہیں ۔ والد بھی جاگ اٹھے تھے مجھے بلاکر پوچھا کہ کیا ہوا ۔ میں نے کہا گھی کی ہانڈی گر پڑی ہے ، کہنے لگے
کوئی چیز خراب تو نہیں ہوئی ۔ میں نے کہا نہیں ، بجز مولوی صاحب کے پاؤں کے ۔ والد یہ سُن کر ہنس پڑے ۔
مولوی صاحب نے اچھی عمر پاکر چند سال ہوئے انتقال فرمایا ۔

مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی

ان کا خطاب شمس العلماء تھا جو نہ صرف معنی بلکہ صورت کے لحاظ سے بھی ان کے واسطے

موزوں تھا۔ پنجاب کے اکثر مناظرے انھوں نے جیتے۔ مولانا ابوالوفا ثناء اللہ سے پہلے شیر پنجاب انھیں کو سمجھنا چاہیے۔ ایک ماہانہ رسالہ اشاعت السنہ نکالتے تھے۔ ان کی علمی قابلیت مسلّم تھی اور اہل حدیث میں خاص نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں کسی ضرورت سے لاہور آئے گئے۔ مجھ کو دیکھنے کے لئے پیسہ اخبار کے دفتر میں تشریف لائے۔ اس وقت ان کی شکل ایسی ہوگئی تھی کہ میں مشکل سے پہچان سکا۔

مولوی عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی

بھوپال میں کبھی تشریف نہیں لائے مگر مرشد آباد کے مناظرے اور مولوی شبلی نعمانی کی سیرۃ النعمان کی تنقید حسن البیان نے ان کو اہل حدیث میں بہت مقبول بنا دیا تھا۔ مجھے ان کے دیکھنے اور اُن سے ملنے کی آرزو تھی۔ جس زمانے میں میں علی گڑھ میں تھا۔ اس زمانے میں وہاں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے جلسہ میں تشریف لائے تھے۔ جاکر ملاقات کی اور کئی گھنٹے خدمت میں رہا۔ ان کی متانت اور معقولیت دل کش تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ نہ صرف عالمانہ بلکہ مجاہدانہ صفات کے آدمی ہیں۔

یہ حضرات جن کا ذکر میں نے کیا اس زمانے کے چوٹی کے علماء اہل حدیث تھے جو نہ صرف علمیت میں بلند پایہ تھے بلکہ دینداری، پرہیزگاری اور اخلاص و ریاضت میں بھی ممتاز تھے۔ ان کی یہ خوبیاں اس قدر نمایاں تھیں جن کو دیکھ دیکھ کر لاکھوں مسلمانوں نے ان کا رنگ اختیار کر لیا اور جماعت اہل حدیث کی علمی اور دینی ساکھ ہر جگہ قائم ہوگئی۔ ان کی کوششوں سے ہندوستان میں شرک و بدعت کا بہت کچھ ازالہ اور کتاب و سنت کا منارہ بلند ہوا۔ متعصب مخالفوں کے مقابلوں میں انھوں نے جس صبر و ثبات سے کام لیا وہ نہ صرف قابل تحسین بلکہ ان کے ایمانوں کی پختگی کا نشان تھا۔ یہ بھی مانتا ہوں کہ اسی جماعت کی بدولت ہندوستان میں تقلید کا جمود ٹوٹا جس سے دماغوں میں روشنی اور وسعت پیدا ہوئی۔ لیکن تصویر کا دوسرا رُخ بھی جسے میں دیکھ رہا ہوں اگر بیان نہ کروں تو حقیقت پوشی کا مجرم ٹھہروں گا۔

کچھ اہل حدیث کی نسبت

ابتدا میں یہ جماعت اعلائے کلمۃ الحق کے جمہوری مقصد کو لے کر اٹھی تھی اور اس نے اپنا کوئی

امتیازی نشان قائم کرکے اپنے آپ کو ایک جداگانہ فرقہ بنانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن مولانا اسمٰعیل شہید علیہ الرحمہ کی کوششوں کی ناکامی کے بعد غیر شعوری طور پر اس کا رخ بدل گیا اور بجائے احیاءِ ملت کے صرف احیاءِ سنت مطمحِ نظر رہ گیا جس کی وجہ سے اس کا تمام تر مقابلہ دوسرے اسلامی فرقوں کے ساتھ آپڑا اور یہ بھی ایک فرقہ بن کر رہ گئی جس کے تمام مقاصد جماعتی ہوگئے اور بجائے کفار اور دشمنانِ اسلام کے خود مسلمانوں بالخصوص مقلدوں کے ساتھ اس کو تعصب پیدا ہوا۔

چونکہ حدیث کی بنیاد پر یہ عقیدہ قائم کیا گیا کہ جو کسی مُردہ سنّت کو زندہ کرتا ہے اس کو سَو شہیدوں کا ثواب ملتا ہے اس لئے اس جہادِ اکبر یعنی احیائے سنت کے واسطے روایات میں حد سے زیادہ غلو ہوگیا۔ گوشوں گوشوں سے چھپی ہوئی حدیثیں علماء نے نکالنی شروع کیں اور ان ہی مخصوص سنتوں کے احیاء کو اپنا طرّۂ امتیاز بنایا۔ کسی نے سانڈ کی حلّت کا فتویٰ دیا اور اس کی بحث شروع کردی۔ کسی نے ایک ہی ہاتھ سے مصافحہ کو سنّت بتایا اور اس پر رسالہ بازی کرنے لگا کسی نے آخر ذی الحجہ تک قربانی کو سنت کہا اور اسی کی اشاعت میں لگ گیا اور کسی نے کہا کہ سر پر بالوں کا رکھنا سنت ہے اور جو نہ رکھے اس کے پیچھے نماز جائز نہیں۔ غرض ایک ایک مولوی ایک ایک سنت کے احیاء اور سوسو شہیدوں کا ثواب لینے کے پیچھے لگ گیا۔ غدر کے بعد سے آج تک امن کا ایک طویل زمانہ ان کو نصیب ہوا جس میں اصلاح اور ترقی ملت کے بڑے بڑے کام ہوسکتے تھے مگر ان کی اس ہفتاد سالہ دینی بحثوں اور کوششوں پر اگر نظر ڈالی جائے تو وہ بیشتر شاعر کے اس قول کی مصداق ہیں ؎

غنیمت ہے شبِ فرقت کی فرصت   رسالہ لکھیئے تحقیقِ کمر میں

اس میں کچھ شک نہیں کہ محکومیت میں قومیں بیکار رہ کر بند پانی کی طرح سڑتی ہیں اور باہمی فرقہ بندیوں اور جھگڑوں سے اسی قسم کی فساد کی بو ان میں پیدا ہوتی ہے مگر ایک اہم سبب اس کا قرآن سے غفلت بھی ہے جو حدیثوں میں انہماک کی وجہ سے پیدا ہوا۔ یہ قرآن کو پڑھتے ضرور ہیں اس میں غور بھی کرتے ہیں، اس کی تفسیریں بھی لکھتے ہیں لیکن محض علمی حیثیت یا حدیثوں کی تائید کی غرض سے انھوں نے اصل دین روایات کو قرار دے رکھا ہے جن کے اوپر ان کے تمام اعمال کا دارومدار ہے۔ ہر امر میں روایتی سند کے اس قدر خوگر ہوگئے ہیں کہ تمام تر

اپنے آپ کو ماضی سے وابستہ کرلیا ہے۔ پھر آگے کیسے بڑھیں اور تقدم کی صلاحیت کہاں سے پیدا ہو۔ یہ تو صرف قرآن ہی ہے جو زندہ ہے اور زندگی بخش ہے۔ اسی سے مسلمان اپنا مستقبل تعمیر کرسکتے ہیں۔ وہ نورِ مبین ہے جو انسان کے دل و دماغ کو منور کرکے اس کی بصیرت کو حقائق کی گہرائیوں تک پہنچاتا اور وسعتِ نظر پیدا کرتا ہے۔ اگر اس کی تعلیمات کو خود اسی سے سمجھنے کی کوشش کی جائے اور روایات کے غلاف اس کے اوپر نہ چڑھائے جائیں تو امم اسلامیہ میں جس قدر تفرقے اشخاص و روایات پرستی سے پیدا ہوئے ہیں سب کو مٹا کر ملت کو متحد کرسکتا ہے۔ اگر ہندوستان میں ایک جماعت ایسی نکل آئی جس نے اپنے علم و عمل کا مرکز اسی کتاب کریم کو قرار دیا تو سمجھنا چاہیئے کہ یہاں غیر مقلدیت کی تحریک بار آور ہوئی۔

میں اس موقع پر اُن نوجوان سعادتمند روحوں سے خطاب کرتا ہوں جن کے اندر اُمت کا درد اور حق کی محبت ہے کہ وہ اللہ کی اس کامل کتاب کی طرف رجوع کریں جو ہر تاریکی کے لئے نور اور ہر دُکھ کے لئے شفا ہے اور جس میں دین مکمل کردیا گیا ہے۔ رہے اہل حدیث تو۔

"اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو — جو روایات پہ قرآں کو فدا کرتے ہیں
راویوں پر انھیں ایمان ہے نبیوں کی طرح — جو کہ تقلید کو بھی شرک کہا کرتے ہیں
"ان بزرگوں کا عقیدہ ہے کہ ناقص ہے کتاب" — جس کی تکمیل حدیثوں سے کیا کرتے ہیں

علماءِ حنفیہ

مولوی عبدالحق صاحب

شہر بھوپال کے قاضی تھے اور علوم دینیہ و عقلیہ میں فاضل۔ صوبۂ سرحد کے باشندے تھے اور ولایتیوں کے محلہ چھاؤنی میں رہتے تھے جہاں اب میوزیم ہے۔ محکمۂ قضا کا کام کم تھا اس وجہ سے زیادہ وقت تدریس میں صرف کرتے تھے اور اچھے مدرس مشہور تھے۔ ابتدائی کتابوں سے لیکر اوپر تک کی تمام کتابیں پڑھاتے تھے۔ والد میں اور ان میں باہمی محبت ایسی تھی جیسی دو بھائیوں میں ہوتی ہے۔ ان کا دفتر ہمارے محل کے قریب تھا۔ اس وجہ سے کبھی کبھی ہمارے یہاں آجاتے تھے۔ ان کو عام طور پر طلباء اور بالخصوص میری جماعت سے بہت دلچسپی تھ

جب آتے تو ہم سب اس کے اردگرد بیٹھ جاتے اور کوئی نہ کوئی علمی بحث چھیڑ دیتے۔ وہ ہر بحث میں خوشی کے ساتھ حصہ لیتے اس لئے ان کی صحبت ہمارے لئے بہت پرلطف ہوتی تھی۔ وہ مجھکو "مولانا حافظ" کہتے تھے۔ اور یہ خطاب میں نے ان سے حاصل کیا تھا۔ صورت یہ ہوئی کہ ایک بار وہ تشریف لائے۔ ہمارے ساتھیوں میں سے ایک شخص مولوی فتح محمد بڑے صرفی تھے۔ انھوں نے یہ بحث اٹھائی کہ صرفیوں نے ثلاثی مجرد کا آٹھواں باب ماضی مضموم العین اور مضارع مفتوح العین کیوں رکھا جبکہ ان کو ساری عربی زبان میں ڈھونڈنے سے بھی کوئی لفظ سوائے "کاد یکاد" معتل العین کے نہ مل سکا۔ مضارع کو تو ہم مان لیتے ہیں کہ مفتوح العین ہے مگر ماضی کو مضموم العین یقین کرنے کی کیا صورت ہے۔ اس لئے کہ اس کے عین کلمہ کی کوئی بھی حرکت بہ تعلیل سے واو الف سے بدل جائے گا۔ قاضی صاحب نے کہا کہ تمھارا اعتراض درست ہے۔ اکثر علمائے صرف نے آٹھویں باب کو تسلیم نہیں کیا ہے اور کاد یکاد کو سمع یسمع سے قرار دیا ہے۔ میں نے کہا کہ جناب آٹھواں باب قرآن میں مستعمل ہے اور اگرچہ صرفیوں کو اس کی کوئی مثال نہیں مل سکی لیکن میں نے تلاش کرلی ہے۔ قاضی صاحب نے پوچھا کہاں؟ میں نے کہا سورۂ کہف کے پہلے رکوع میں ہے "كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ" ماضی مضموم العین اور سورۂ نساء کے پہلے رکوع میں ہے "وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَنْ يَكْبَرُوا" مضارع مفتوح العین۔ انھوں نے فوراً قرآن منگایا۔ جب دیکھ کر اچھی طرح اطمینان کرلیا تو بہت خوش ہوئے اور والد کے سامنے مجھ کو مولانا حافظ کا خطاب دیا۔

وہ کبھی کبھی والد کو اور مجھ کو اپنے یہاں مدعو کرتے۔ عشاء کے بعد دیر بعد تک باتیں رہتیں۔ اس قدر شگفتہ اور ہنس مکھ تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کا کوئی تردد، فکر یا رنج کبھی ان کے پاس نہیں پھٹکتا۔ ریاضت کا نور چہرہ سے برستا تھا اور گفتگو سر تا سر علمی ہوتی تھی اور دل کش۔ میں جب تک ان کی خدمت میں بیٹھتا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جنت الفردوس میں ہوں۔

ایک بار انھوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کا ذکر چھیڑا کہ اس کا ایک خلیفہ ڈاکٹر عبدالحکیم ہے جو الہام کا مدعی ہوا ہے۔ مرزا نے تصدیق کی ہے کہ اس کا الہام صحیح ہوتا ہے۔ اب ڈاکٹر کو الہام ہوا ہے کہ مرزا جھوٹا ہے۔ یہ کہہ کر مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور فرمایا کہ اب بولو مرزا سچا

ہے کہ جھوٹا۔ میں نے کہا کہ یہ تو وہی ملا حسن کے قضیۂ منطقیہ "کلامی ھذا کاذب" والی بحث ہے کہ اگر نسبت حکمیہ صحیح نہیں تو قائل کے کذب میں کیا شبہ ہے اور اگر صحیح ہے تو چونکہ محمول کاذب ہے اس لئے وہ صادق ہونے پر بھی کاذب ہی ہوگا۔ یہ جواب سُن کر بہت خوش ہوئے اور والد کی طرف آنکھوں سے اشارہ کرکے میرے انتقال ذہنی کی داد دی۔ واپسی میں میں نے والد سے کہا کہ قاضی صاحب اگرچہ حنفی ہیں مگر امید ہے کہ جنتی ہوں گے۔ وہ یہ سُن کر مسکرائے۔ ان کے مسکرانے کی وجہ یہ تھی کہ ہماری جماعت میں چند دنوں پہلے یہ بحث چھڑ گئی تھی کہ فرقہ ناجیہ کون ہے جس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ہمارے قرآن کے سبق میں شیخ محمد عرب صاحب بھی والد کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ کشاف کا ایک نکتہ تفسیری بہت پسند کیا گیا۔ شیخ محمد نے فرطِ خوشی سے کہا کہ زمخشری اگرچہ معتزلی تھا لیکن امید ہے کہ اس کی بخشش ہوگی۔ اس پر ہمارے ساتھیوں میں سے عبداللہ جُدلی جو کٹر اہلحدیث تھے بول اٹھے کہ فرقہ ناجیہ تو صرف اہلحدیث ہے اور "لا تزال طائفۃ من امتی یقاتلون علی الحق الخ" کی پیشگوئی انھیں کے لئے ہے۔ اس بحث نے طول کھینچا۔ آخر میں والد نے کہا کہ جنت کا وعدہ اللہ نے ایمان اور عمل صالح پر فرمایا ہے جس کے لئے کوئی فرقہ مخصوص نہیں۔ میری سمجھ میں یہ بات آگئی لیکن میرے بعض ساتھی اپنے خیال پر اڑے رہے۔ انھوں نے شہر کے تمام طلباء میں اس مسئلے کو پھیلایا اور جابجا اس پر بحثیں ہونے لگیں۔

جُدلی نے ایک دن مجھ سے کہا کہ تم کس کو فرقہ ناجیہ سمجھتے ہو؟ میں نے کہا کہ "میں تم سے متفق ہوں۔ کیونکہ حضرت انسؓ کی روایت ہے "اکثر اھل الجنۃ البلہ" اور جنتی ہونے کی یہ علامت زیادہ تر اسی فرقہ میں دیکھتا ہوں۔" کہنے لگے کہ یہ تو مذاق ہے۔ صحیح رائے بیان کرو۔ میں نے کہا کہ جب تم حدیث نہیں مانتے تو رائے کیا مانو گے۔

مولوی ماجد علی صاحب

مولانا عبدالحق صاحب خیرآبادی کے ممتاز شاگردوں میں سے تھے۔ مشہور یہ تھا کہ اٹھ سال تک ان سے منطق پڑھی ہے۔ مجھے اس زمانے میں منطقیوں کے ساتھ بڑی دلچسپی تھی او میں اُن کو اہل علم میں سب سے زیادہ معزز سمجھتا تھا۔ مولوی صاحب چونکہ مانی ضلع جون ا کے رہنے والے تھے اس لئے ہموطنی کے تعلق سے کئی بار ہمارے یہاں آئے۔ مجھے اُن کی با

بہت پسند تھیں۔ خاص کر منطقیانہ طنزیات اور تجہیل عالم کے خطبے جو خیرآبادیوں کی مخصوص چیزیں ہیں۔ میں نے انہیں کے لباس جیسا لباس بھی اپنے لئے تیار کرایا تھا مگر اس کو پہنا نہیں کیونکہ یہ ڈر ہوا کہ والد اس منطقی وردی میں مجھ کو دیکھیں گے تو خیال کریں گے کہ مقلد ہے۔ ان کے رشتہ کے ایک بھائی باب اللہ ہمارے ساتھ پڑھتے تھے۔

مولوی برکات احمد صاحب ٹونکی

یہ بھی مولانا عبدالحق صاحب خیرآبادی کے شاگردوں میں سے تھے۔ بھوپال میں قاضی محمد ایوب صاحب کے یہاں رہتے تھے۔ میرا ارادہ ہوا کہ ان کی خدمت میں حاضر ہوں مگر سنا کہ وہ اہلحدیث کو کافر سمجھتے ہیں۔ اس وجہ سے ملاقات کا شوق بجھ گیا۔ یہ کفر کی خلیج اہلحدیث اور خیرآبادیوں کے درمیان مولانا فضل حق کے وقت سے حائل ہوئی جنھوں نے امتناع نظیر کے مسئلہ پر کتاب لکھ کر مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی تکفیر کی۔ اسی کا سلسلہ آج تک چلا جاتا ہے۔ اُن کے عقیدہ کی بنیاد یہ ہے کہ الوہیت نے جب تعین اختیار کیا تو وہی حقیقتِ محمدیہ ہوگئی جیسا کہ اُن کے شاعر نے کہا ہے:

وہی جو مستویٔ عرش ہے خدا ہوکر — اتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفیٰ ہوکر

لہٰذا نہ صرف اس کا نظیر ممتنع ہے بلکہ اس کو بشر سمجھنا بھی غلطی ہے۔

مولوی صاحب کے پاس منطق پڑھنے کے لئے طلباء کی ایک جماعت جاتی تھی جن میں سے ایک شخص محمد عمر سیستانی صاحب استعداد تھے۔ انھوں نے مولوی ماجد علی صاحب سے بھی کچھ دنوں پڑھا تھا۔ کہتے تھے کہ مولوی صاحب کو مسائل مستحضر ہیں مگر ذہانت وہ نہیں ہے جو مولوی ماجد علی میں ہے

ان کے انتقال کے بعد ان کے حالات نظر سے گزرے جن کو اُن کے ایک شاگرد نے لکھ کر شائع کرایا تھا۔ اور ان کو زمانۂ گزشتہ کے کسی بڑے امام سے بھی کچھ بڑھ کر دکھانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے دیکھ کر حیرت ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ اگر شاگرد استاد کی، مرید پیر کی، اور بیٹا باپ کی تاریخ لکھے تو سوائے واقعات کے اور باتیں بہت احتیاط کے ساتھ قبول کرنی چاہئیں۔ بلکہ واقعات میں بھی تنقید اور تحقیق کی ضرورت ہے۔

مولوی لطف الرحمن صاحب بردوانی

وزیر عبدالجبار خاں کے ساتھ کلکتہ سے آئے تھے اور ان کے بڑے بیٹے عبدالحلیم کے اتالیق

تھے۔ منطق میں ان کا دعویٰ آسمان سے بھی زیادہ اونچا تھا مگر چونکہ حدیث دلی میں میاں صاحب سے پڑھی تھی اس وجہ سے اہلِ حدیث کو کافر نہیں سمجھتے تھے۔

وزارتِ خانہ صدر منزل میں ہمارے دروازے کے بالکل سامنے تھا۔ میں وہاں روزانہ شام کو اخبارات پڑھنے کے لئے جاتا تھا۔ مولوی صاحب میرے منتظر رہتے تھے۔ وہ چونکہ اپنی تعریف سے خوش ہوتے تھے اس وجہ سے یہ صحبت بہت پُرلطف ہوتی تھی۔ حکیم عبدالکریم بھی جو شہر کے منصف اور میرے دوست تھے اس وقت آجاتے تھے مولوی صاحب کو بھی خوش کرتے تھے اور مجھے بھی ہنساتے تھے۔

مولوی صاحب نے بنگال میں کسی مقام پر رضاعی بھائی بہن کا نکاح کرادیا تھا۔ اس پر وہاں کے مولویوں نے ان کے خلاف رسالے لکھے لیکن انھوں نے یہ پہلو اختیار کیا کہ زید نے ہندہ کا دودھ پیا لیکن زینب کو جو ہندہ کی بیٹی ہے اپنی ماں کا دودھ نصیب نہیں ہوا۔ لہٰذا زید اور زینب میں نہ رضاعت کا رشتہ ثابت ہے نہ ولادت کا۔ اس لئے ان کے نکاح پر حرمت کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ جوابات ایسی منطقی زبان میں لکھتے تھے جس کو اُن کے سوا کوئی دوسرا سمجھ نہیں سکتا تھا۔ آخر ی بنگالی مولوی خاموش ہوگئے۔

فارسی دانی کا بھی دعویٰ رکھتے تھے۔ نواب سلطان جہاں بیگم کی تخت نشینی کے موقع پر فارسی نثر و نظم میں تہنیت نامہ لکھا جو سرتاسر منطقی اصطلاحات سے لبریز تھا۔ مجھ سے تقریظ کی فرمائش کی میں نے ایک لطیف نظم لکھ کر دے دی جس کو بہت پسند کیا اور اس کے ساتھ طبع کرالیا۔ اس کا ایک شعر یہ ہے:

منطقی ایسے کہ گویا ہیں مجسّم منطق جس نے دیکھا نہ ہو منطق وہ کرلے درشن

شعرائے بھوپال کو طبع آزمائی کا ایک نادر موقع مل گیا۔ انھوں نے ذومعنیین نظمیں لکھ لکھ کر ان کے پاس بھیجیں۔ مولوی صاحب نے ان سب کے ساتھ پھر دوبارہ اس کو طبع کرایا۔ وہ مجموعہ آج بھی جب کبھی میری نظر کے سامنے آجاتا ہے تو پڑھ کر لطف اندوز ہوتا ہوں۔

مولوی ہدایت اللہ خاں صاحب رامپوری

مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی کے شاگرد رشید تھے۔ جون پور کے مدرسہ میں مفتی محمد یوسف صاحب کے بعد مدرس ہوئے اور وہیں اپنی پوری زندگی گزار دی۔ چونکہ مولوی لطف الرحمٰن صاحب

کے استاد تھے ۔ اس وجہ سے انھوں نے ان کو بھوپال بلایا تھا وزیر صاحب کے یہاں مہمان تھے ۔
والد نے بھی جون پوری کے مدرسہ میں تعلیم پائی تھی اس وجہ سے ان سے شاگردوں کی طرح جاکر ملے۔
میں بھی ساتھ تھا ۔ پھر وہ ہمارے گھر بھی کئی بار آئے بہت کم سخن تھے ۔ سن بھی اس وقت زیادہ ہوگیا
تھا ۔ درویشوں خاص کر مجددوں کے حد سے زیادہ معتقد تھے ۔

مولوی لطف اللہ صاحب

علی گڈھ کے مشہور استاد حیدرآباد دکن میں عدالت العالیہ کے مفتی ہوگئے تھے ۔ ایک بار وطن
جاتے ہوئے بھوپال میں ٹھہرے ۔ والد کے ساتھ میں بھی ملنے کے لئے گیا ۔ یہ بھی کم سخن تھے اور مریض ۔
واپس آکر والد نے کہا کہ ان کو کسی دشمن نے زہر دیدیا تھا جس کا اثر برابر چلا جاتا ہے ۔ جب میں علی گڈھ
کالج میں آیا تو کئی بار ان کے مکان پر جاکر زیارت کی ۔ اس وقت خانہ نشین تھے اور آنکھوں سے
معذور ۔ علم ہیأۃ میں خاص طور پر شہرت رکھتے تھے ۔ قاضی عبدالکریم نے جن کے نام سے علی گڈھ کا
چوک مشہور ہے مجھ سے کہا کہ وہ مدتوں اہل حدیث رہ چکے تھے ۔

یہ چند مشاہیر علماء کا ذکر ہے جن کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ۔ میں جانتا ہوں کہ یہ
عوام کے لئے دل کش نہ ہوگا ۔ لیکن کبھی اگر اپنے ان تعلقات کو لکھ سکا جو بھوپال کے امراء اور شعراء
کے ساتھ تھے تو غالباً دلچسپ داستان ہوگی مگر دین یا اصلاحِ ملت سے ان کا تعلق نہیں ہے
اس لئے غیر ضروری سمجھتا ہوں ۔

حواشی :

؎۵ یہ مسجد وسط شہر میں واقع ہے جس میں اس زمانہ میں چالیس پچاس طالب علم رہتے تھے ۔ ان میں سے
اکثر دو، کو ۵ ۲ سیر گیہوں ماہانہ سرکار سے ملتے تھے باقیوں کے لئے دیگر وظائف کا بندوبست ہوجاتا تھا ۔ وہ زمانہ چونکہ
بھوپال میں عام خوش حالی کا تھا ۔ اس وجہ سے اکثر بلکہ روزانہ شادی، غمی، تیجا، چہلم وغیرہ کی دعوتیں ان طلباء کو نصیب ہوتی
تھیں اور ان کی پانچوں انگلیاں ہمیشہ گھی میں تر رہتی تھیں ۔ یہ مشہور تھا کہ ابراہیم پورہ کی مسجد میں ایک چٹائی کی جگہ ایک اقلیم کے
تخت کے برابر ہے ۔ میں نے ایسی مثالیں بھی دیکھیں کہ لوگ یہاں سے پڑھ کر اپنے وطن واپس آگئے ۔ ایک مدت کے بعد پھر جب

بھوپال کا پلاؤ زردہ یاد آیا دوبارہ آکر داخل ہوگئے۔ اس میں ایسے طلبار بھی تھے جن کو اپنے داخلے کی تاریخ بھی یاد نہ تھی اور جن کی عمریں چالیس سال سے بھی زیادہ تھیں۔ یہ صرف بھوپال ہی کا حال نہیں بلکہ تمام اقطاع ہند میں عربی خوان طلبہ کے گزارہ کی شکل بیشتر اسی قسم کی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علم وفضل حاصل کر لینے کے بعد بھی بالعموم دنائت طبع اور پست خیالی ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔

۲ - مولانا احسن صاحب بلگرامی اپنے فن کے ایک ہی شخص تھے، انھوں نے ایک نقشۂ الف ترتیب دیا ہے جس سے ہر شخص بلا غور وفکر کی زحمت کے فارسی اور اردو شعر کہہ سکتا ہے یا اس کا ترجمہ اتار سکتا ہے۔ بھوپال میں یہ مشہور تھا کہ مولوی احسن کا سایہ بھی کسی پر پڑ جائے تو وہ شاعر ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا لقب شاعر گر تھا۔ ان کا یہ نقشہ اب بھی میرے پاس ہے لیکن مرموز ہے جس کو حل کرنے والا ابھی تک کوئی نہیں ملا۔ ۱۹۱۷ء میں بھوپال کا سفر اسی لئے میں نے کیا تھا۔ مگر اس وقت وہاں اُن کا کوئی شاگرد جس نے ان سے یہ نقشہ پڑھا ہو نہیں مل سکا۔

۳ - یہ طلبار کا اصطلاحی لفظ ہے۔ استاد سے سبق پڑھ لینے کے بعد جماعت الگ بیٹھ کر اسی سبق کو آپس میں مل کر دہراتی تھی اسی کا نام تکرار تھا۔ یہ اس زمانے میں عام تھا اور بالخصوص ہماری تعلیم میں لازمی قرار دیا گیا تھا۔

۴ - مولانا جند اور قل احمد خیالی کے دو حاشیہ نگاروں کے نام ہیں۔

۵ - میں نے علم دنیا کے لئے حاصل کرنا چاہا لیکن علم نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ اللہ کے سوا کسی اور کے لئے ہو۔ (ادارہ)

۶ - تم ایسے شخص ہو جس میں جاہلیت کے آثار ہیں (ادارہ)

۷ - انسان کے لئے اس کے ذاتی فضائل کا اظہار اس سے بہتر طریقے پر نہیں ہو سکتا کہ وہ خود دوسروں کی خوبیوں کا اعتراف کرے۔ (ادارہ)

۸ (الف) - اس مقام پر جہاں اپنی محبوبہ کے ساتھ ٹھہرا کرتا ہوں، میں نے اس کے حق میں دعائیں کی ہیں اور مجھے اس بات کی گواہی دینے میں بھی عار نہیں کہ وہ بھی میرے لئے دعاگو رہی ہے (ادارہ)

۸ - کاش کہ میں بھی کسی دن اس کے مانند ہو جاتا، کاش کہ کبھی میری تمنائیں بھی بر آتیں (ادارہ)

۹ - اے عبدالغفور! تمہاری ملاقات سے میرے دل کی کلی کھل جاتی ہے، میری روح کو بالیدگی ملتی ہے میرے چمنستان میں بہار آجاتی ہے۔

اور تمہاری آواز میرے کانوں کے لئے نغمۂ جاں فزا ہے اور تمہارے اشعار میرے دل کے لئے لذیذ ترین غذا ہیں۔

بلند تمہارا اخلاق ایک لطیف باغ ہے اور تمہارا حسن خدا کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے،
تم نے آخر کس چیز میں مجھ کو اپنے سے برتر سمجھا اور آخر وہ کیا وصف تھا کہ میں تمہارے لئے قابلِ
رشک بنا؟ (ادارہ)

سنلہ لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں (ادارہ)

سلہ۔ (صفحہ ۳۰ کی آیت کا ترجمہ) اس کے سوا تمہارے لئے کوئی اور پناہ گاہ نہیں ہے (ادارہ)

سلہ۔ پرویز صاحب کی تفسیر "معارف القرآن" کے نام سے شائع ہو گئی ہے، تفصیل ان کے مضمون میں
صفحات ۷۸ - ۸۶) ملاحظہ ہو (ادارہ)

سلہ۔ پیدائش: ۱۲۸۳ھ، وفات: ۱۷ر شوال ۱۳۵۳ھ (ادارہ)

سلہ۔ پیدائش: نومبر ۱۸۴۷ء، وفات: ۱۳ر نومبر ۱۹۴۵ء (ادارہ)

سلہ۔ یہ دکیو مرزا ثاقب قزلباش کے والد تھے جو لکھنؤ کے موجودہ شعراء میں خاص امتیاز رکھتے ہیں، ان کی
غزلیں اس وقت بھی جب کہ وہ بالکل نوجوان تھے، میرے لئے دلکش تھیں۔

سلہ۔ تمہارے بعد جو چاہے مر جائے، کیونکہ میں تو تمہارے ہی بارے میں تضاد تقدیر سے ڈرتا تھا (ادارہ)

سلہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو قبیلوں اسلم اور غفار کے متعلق فرمایا تھا کہ: "اسلم سالمہ
اللہ و غفار غفر اللہ لہ"

سلہ۔ حضرت! عربی میں فرمایئے (ادارہ)

سلہ۔ عرصہ ہوا، انتقال ہو گیا (ادارہ)

سلہ۔ ادھر چند سال ہوئے، سید رشید رضا مرحوم نے اس کتاب کو اپنے مقدمے کے ساتھ مصر سے شائع کیا۔

سلہ۔ پیدائش: ۱۲۶۴ھ، وفات: ۱۳۰۴ھ، بعمر ۴۰ سال (ادارہ)

سلہ۔ اس میں شرط یہ تھی کہ پہلی گفتگو یہی حدیث ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قاضی صاحب تک بہ سلسلہ
اسناد اسی صورت میں پہنچی تھی۔ اوّل ما قال الخ

سلہ۔ اچھے شاعر تھے، پہلے عیش تخلص کرتے تھے، ایک ناگوار حادثہ پیش آگیا جس کی وجہ سے بھوپال چھوڑنا پڑا،
اس وقت برہم تخلص رکھا اور گورکھپور جا کر وہاں سے "مشرق" نامی اخبار نکالنا شروع کیا۔

(عربی اشعار کے ترجمے کے لئے ہم مولانا سید محمود الحسن ندوی اور جناب زبیر احمد فاروقی کے ممنون ہیں۔ ادارہ)

مولانا اسلم جیراجپوری مرحوم

"جامعہ"

زندگی نازد نیاز و سوز و ساز دل میں ہے
ہائے وہ زندہ کہ جو مدفون آب و گل میں ہے

بوئے پریشاں ہو کے نکلی خیمۂ گلزار سے
کب سبک روحوں کو آسائش کسی منزل میں ہے

بادیہ گردی ہے مجنوں کے لئے سامانِ زیست
ایک جانِ تازہ ہر نظارۂ محمل میں ہے

پوچھ آسانی پسندوں سے ہے آسانی کہاں
جو نہیں مشکل میں ہے، وہ بھی بڑی مشکل میں ہے

عشرتِ شاہی میں بھی حاصل نہیں پرویز کو
وہ مزا جو کوہکن کی سعیِ بے حاصل میں ہے

شیخ ہند و اجمل و جوہر کی روحِ انقلاب
جامعہ ملیہ کے سر میں، جگر میں، دل میں ہے

گو نہیں ساقی مگر ساقی کا جام آتشیں
رات دن گردش میں رندوں کی بھری محفل میں ہے

مولانا محمد اسلم جیراجپوری مرحوم

امام

عروج پا نہیں سکتی جہاں میں وہ ملت
کہ جن کا کوئی نہ مرکز ہو اور نہ کوئی نظام

ہو گرچہ ریگ بیاباں کی طرح لاتعداد
ہوا کے جھونکوں میں اڑتی پھرے گی صبح و شام

اگر ہو نظم تو ملت ہے آہنی دیوار
کہ جس کے سامنے طوفاں کو بھی نہیں ہے ثبات

یہ نظم کیا ہے، فقط ایک نقطۂ مرکز
زبانِ شرع میں جس کو کہا گیا ہے امام

ہیں اجتماعی مقاصد اسی سے وابستہ
امام زندہ ہے ملت کی زندگی کا قوام

جہاں کی دوسری قوموں کا ہے نسب پہ مدار
مگر ہے ملتِ اسلام جامع الاقوام

اساس اس کی ہے بس "لا الٰہ الا اللہ"
اسی اساس پہ قائم ہوئی اخوتِ عام

نہ کوئی نسل، نہ کوئی زباں، نہ کوئی ملک
ہے امتیاز سیاہ و سفید و سرخ حرام

ہے اس کے ربط میں قوموں کا ارتباط بہم
ہے اس کے نظم میں دنیا کی امتوں کا نظام

یہ کیا غضب ہے کہ مسلم کو یہ نہیں معلوم
سپرد کی گئی اس کو، امامتِ اقوام

امام ملتِ اسلام نائبِ حق ہے
تمام اہل جہاں جس کے حکم کے ہیں غلام

اگر ہے دینِ محمدؐ کا پاس امت کو
تو آج نصب امامت ہے اس کا پہلا کام

پروفیسر محمد مجیب

مولانا اسلم مرحوم

ہم جانتے ہیں کہ دنیا فانی ہے اور قدرت جسے زندگی بخشتی ہے، ایک دن اس کی زندگی کا سلسلہ بھی ختم کر دیتی ہے۔ وجود اور عدم کے مسئلے ہمارے علم سے بالاتر ہیں اور خالی مشاہدۂ قدرت کے قانون میں کوئی معنی نہیں پیدا کر سکتا۔

ہمیں کبھی معلوم نہیں ہوتا کہ ہم جو کچھ سوچتے ہیں اور کرتے ہیں اس کا کوئی باقی رہنے والا اثر کہیں پڑتا ہے یا نہیں پڑتا اور اگر انفرادی کوشش خود اتنی حقیر ہوتی ہے کہ اس کے نتیجے کا سراغ لگانا لاحاصل کہا جا سکے تو اجتماعی کوششوں کی حقیقت کیا ہے۔ انسان میں پائیداری ہوتی ہے تو کس طرح پیدا ہوتی ہے اور فنا کے بدلتے ہوئے رنگوں سے ثبات کی کوئی بامعنی تصویر بنتی ہے تو کس طرح بنتی ہے۔

یہ مسئلے ایسے ہیں کہ ہمیں بغیر کسی تحریک کے ان پر اکثر غور کرتے رہنا چاہئے۔ ہم ایسا نہیں کرتے شاید کر بھی نہیں سکتے، مگر جب ہمیں موت یاد دلائے کہ ہم صرف زندگی کی چھوٹی فکروں میں لگے ہوئے ہیں اور ہمیں انجام کی خبر نہیں تو ہمیں ضرور سوچنا چاہئے کہ ہماری زندگی میں کوئی معنی اور مقصد ہے یا نہیں اور ہے تو کیا ہے۔

مولانا اسلم مرحوم ہم سے جدا ہو گئے ہیں۔ عمر کے لحاظ سے وہ سب سے بڑے تھے، علم کے اعتبار سے سب سے ممتاز۔ جو لوگ جامعہ کو دینی تعلیم کا ادارہ اور دینی غور و فکر کا مرکز سمجھتے تھے ان کے لئے جامعہ کے علمی کام سے مراد مولانا اسلم مرحوم کی تصانیف تھیں، اور انھیں مولانا اسلم مرحوم کے خیالات میں جامعہ کی دینی سرگرمیاں نظر آتی تھیں۔ ایسے لوگ خوش ہوئے تو جامعہ سے خوش ہوئے اور خفا ہوئے تو جامعہ سے خفا ہو گئے۔ لیکن ایک زمانہ ایسا تھا جب جامعہ کی اتنی حیثیت ہی نہیں تھی کہ لوگ اس سے خوش یا خفا ہوں۔ جب جامعہ

کی بقا کا دارو مدار اس پر تھا کہ جامعہ والے جوش اور استقلال کا نمونہ بن سکیں۔ مولانا مرحوم کو اس وقت ان کی صداقت نے شاعر بنا دیا۔ وہ بہت خوش الحان تھے اور اپنا کلام سناتے تو ایک عجیب کیفیت پیدا کر دیتے تھے۔ آج کل ہم منصوبے بنا کر اور انھیں پورا کرنے کے لئے حکومت سے روپیہ لے کر جامعہ کا کام چلاتے ہیں، ایک وقت وہ تھا کہ جامعہ کا واحد منصوبہ اور کل سرمایہ مولانا اسلم مرحوم کا یہ شعر تھا :

سعیِ پیہم ہے نشانِ قیس وشانِ کوہکن
عشق نے آباد کر ڈالے ہیں دشت و کوہسار

اس شعر نے جامعہ کے کاموں میں معنی اور مقصد پیدا کیا۔ اس شعر نے جامعہ کو آباد کیا، جامعہ کی تاریخ اسی شعر کی تفصیل ہے اور جامعہ کے مستقبل کی کوئی تعمیر ہوگی تو اسی وجہ سے اس میں اس شعر کی تفصیل نئے طریقوں سے بیان ہوگی۔

وجود اور عدم کے مسئلے ہمارے علم سے بالاتر ہیں، مشاہدۂ قدرت کے قانون میں کوئی معنی نہیں پیدا کر سکتا۔ اول اور آخر فنا ہے، ظاہر و باطن فنا ہے، لیکن ایسے نقش بھی نظر آتے ہیں، جن میں ثبات کا رنگ ہوتا ہے، ایسی زندگیاں بھی ہوتی ہیں جن سے زندگی کا اعتبار پیدا ہوتا ہے، وہ جماعت جو ایسے نقش کو بننے کے بعد مٹ جانے دے، جو نمونے کی زندگی کو سامنے سے ہٹا کر بغیر کسی نمونے کی زندگی گذارنا چاہے، وہ اپنے لئے موت نہیں بلکہ بے معنی زندگی کا سامان کرتی ہے، جو موت سے بدتر ہے، وہ جماعت جو وضع داری اور استقلال، یقین اور رفتار رفت کے ہر نقش کو دلوں پر نقش کر لیتی ہے، اسی سے افراد کی زندگی کی تشکیل کرتی ہے، زندگی میں وہ کیفیت پیدا کر دیتی ہے کہ موت بے معنی ہوتی ہے۔

ہمارا زمانہ شدت پسندی کا ہے۔ بیتاب ہونا، شور مچانا، چیخنا چلانا، ذہنی اور جسمانی قوت کی فضول خرچی کرنا کچھ معیار سا ہو گیا ہے، گویا ہم ہسٹیریا کے عارضے کو تندرستی کی علامت مانتے ہیں۔ سنہ ۲۰ء کی قومی تحریک نے بھی بہت سے لوگوں کو شدت پسند بنا دیا تھا۔ جامعہ میں بھی شدت پسند تھے، وہ خاموشی اور استقلال کے ساتھ کام کرنے کی ذمہ داری نہ قبول کر سکے اور

رفتہ رفتہ الگ ہوگئے۔ وہ لوگ جو شدت پسندی کو برا سمجھتے تھے کبھی کبھی قوم کے جمود کو دیکھ کر مجبور ہوجاتے تھے، ان کو مولانا اسلم مرحوم کی وضعداری اور استقلال اور یقین سے بہت سہارا ملا۔ مولانا مرحوم کا جوش کبھی ظاہر نہ ہوتا، ان کی بے چینی ظاہر نہ ہوتی۔ انھیں کامل یقین تھا کہ جامعہ قائم رہے گی اور ترقی کرے گی، انھیں ان لوگوں پر اعتبار تھا جنھوں نے جامعہ کی ذمہ داری اپنے اوپر لی تھی، انھوں نے اپنا کام نہ بڑھایا نہ گھٹایا، ہمیشہ ایک معمول کے پابند رہے، ہمیشہ اپنی طبیعت کے قدرتی توازن کو قائم رکھا۔ وہ اپنی رائے بہت کم ظاہر کرتے تھے، لیکن جب ان کی رائے لی جاتی تو معلوم ہوتا تھا کہ ان میں معاملوں اور طبیعتوں کو سمجھنے کی کتنی اچھی صلاحیت ہے، ان کا یقین ان کی دانائی کی علامت، ان کی فراست ان کے ضبط کا نتیجہ تھی۔ ان کی روزمرہ کی زندگی ایسے اصولوں کی پابند تھی، جن کے صحیح ہونے میں ان کو کوئی شک وشبہ نہیں تھا۔ انھوں نے اپنے طریقے کو چھوڑ کر جامعہ کی زندگی پر اثر ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے ساتھیوں میں ایسے لوگ تھے جو ہر دن کے معاملوں سے اثر لیتے، ان میں الجھتے رہتے، اس طرح کہ ان کا اپنا طریقہ اپنی کوئی وضع نہ بن سکی۔ ایسے لوگ بھی تھے جو وقت کے غلام تھے، غیر مشروط غلامی سے زمانے کو شرمندہ کرنا چاہتے تھے۔ جامعہ میں جو چیز قائم تھی وہ مولانا اسلم مرحوم کا وقار تھا جس نے اپنے لئے جگہ مقرر کرلی اور اس جگہ سے نہیں ہٹا۔ یہ وقار علم کا اور عالم کا وقار تھا۔ مولانا اسلم مرحوم کا علم کتابی نہیں تھا، زمانے سے بے خبر نہیں تھا، دوسروں کے ذہن پر حکومت کرنا اپنا حق نہیں سمجھتا تھا، اسی وجہ سے مولانا اسلم مرحوم اس کا اور اپنا وقار قائم رکھ سکے۔ ان کے علم نے اپنی حفاظت یا غیر کو دور رکھنے کے لئے کوئی حد بندی نہیں کی، ان کا ذہن نئے تصورات، ان کی طبیعت نئے اثرات کو قبول کرنے کے لئے تیار رہتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ اب سے کوئی بیس بائیس سال پہلے میرے دریافت کرنے پر کہ جامعہ میں ڈرامے کئے جائیں اور اسٹیج پر نسوانی کردار کے لئے عورتیں ہوں تو اس پر کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔ انھوں نے ایسا جواب دیا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ خود انھیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اور اگر کوئی کام ضروری یا مفید ہو تو اعتراض کے خوف سے اس کے کرنے میں تامل نہ کرنا چاہئے۔ لیکن یہ جواب ایسا بھی نہیں تھا کہ میں اسے اپنے حق میں فتویٰ سمجھتا۔ عالم کو ہر حال میں محتاط ہونا چاہیے اور مولانا اسلم مرحوم نے کبھی احتیاط کے دامن کو نہیں چھوڑا۔ اب معلوم نہیں کہ ہم میں کون ایسا

ہوگا جو بالکل ہمارا ہوتے ہوئے بھی اپنی عالمانہ خودداری کو ہمارے لئے نمونہ بنائے گا۔ ہمارا خیرخواہ اور سرپرست ہوتے ہوئے اپنے آپ کو روزمرہ کی الجھنوں سے دور رکھ کر ہمیں سکون اور توازن کی قدر کرنا سکھائے گا۔

جامعہ کی تاریخ بیان کرتے وقت ہم اکثر اس کے بانیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ہمیں اکثر یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ جامعہ کے بانیوں میں سے ہر ایک کے ذہن میں جامعہ کے مستقبل کا ایک الگ نقشہ تھا۔ کسی نے اس مستقبل کا خاکہ بنا کر اسے پورا کرنا ہمارے اوپر چھوڑ دیا۔ کسی نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا، اس لئے کہ اس نے کچھ اور سوچا تھا اور ہم نے کوئی اور راہ اختیار کی۔ ہمارے سب سے اچھے سرپرست وہ تھے جو حکیم اجمل خاں اور مہاتما گاندھی کی طرح قدم بہ قدم ہمارے ساتھ چلتے رہے اور ہر طرح سے ہماری مدد کرتے رہے۔ لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ جامعہ کے بانیوں میں ان لوگوں کو بھی شمار کیا جائے، جنھوں نے نئے منصوبے سوچ کر ان پر عمل کیا، جامعہ کو جماعت کے لئے زیادہ مفید بنایا، یا مولانا اسلم مرحوم کی طرح اپنی شخصیت کو ان قدروں کے نئے مثال بنایا جنھیں حاصل کرنا صرف جامعہ کا ہی نہیں بلکہ ہر تعلیم گاہ کا مقصد ہونا چاہئے۔ شخصیت آپ ہی آپ کوئی شکل اختیار نہیں کرتی۔ دراصل جتنی قوت خارجی چیزوں کی تشکیل کے لئے درکار ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ داخلی صفتوں کو پیدا کرنے کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ اس کے لئے قدروں کا ایسا احساس چاہئے جو ناموافق حالات سے متاثر نہ ہو، صبر اور استقلال کا ایک مادہ چاہئے جو زندگی کی حرارت کی طرح قائم رہے اور وہ بصیرت جو انسان کو اس کے مقصد کی طرف اس طرح لے جاتی ہے جیسے روشنی اور گرمی کی خواہش پھول کے رُخ کو سورج کی طرف موڑتی ہے، وہ جذبہ جو داخلی خوبیوں کو پیدا کرتا ہے اور کیا ہوگا سوائے عشق کے جو اپنی تکمیل کے لئے حُسن بن جاتا ہے۔ یہ حُسن مولانا اسلم مرحوم کی شکل میں ہماری جماعت کے اندر رہا اور برسوں رہا۔ خدا کرے یہ ہم میں رہے اور ان جذبات کو جن سے شخصیت فروغ پاتی ہے کارسازی میں مصروف رکھے۔

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی

مولانا اسلم میری نظر میں

مولانا اسلم سے واقفیت تو اسی وقت ہوگئی تھی جب میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ ۱۹۲۵ء میں سب سے پہلے ان کی کتاب حیات حافظ پڑھنے کا موقع ملا۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد انجمن الاصلاح (طلبائے ندوہ کی انجمن) کے کتب خانے میں جاکر مولانا کی دوسری کتاب تلاش کی اور حیات جامی لے کر گھر آیا۔ ان دو کتابوں کے مطالعے کے بعد مولانا سے ایک خاص قسم کی واقفیت ہوگئی۔ ندوہ سے اعظم گڑھ کا ہمیشہ خاص تعلق رہا ہے۔ میری طالب علمی کے زمانے میں ندوہ اور جیراج پور کے طالب علم اچھی خاصی تعداد میں ندوہ میں زیر تعلیم تھے۔ ان میں مولوی زین الحق مرحوم (سابق لکچرر زنانگری کالج) میرے خاص کرم فرما تھے۔ ہم لوگ اکثر ساتھ رہتے۔ مرحوم جیراجپور کے رہنے والے تھے۔ اس طرح جیراجپور سے بھی ایک طرح کا طبیعت کو تعلق ہوگیا، ہمارے استاد مولانا شبلی فقیہ بھی جیراجپور کے رہنے والے تھے۔ مولانا عبدالودود اور ان کے والد مولانا عبدالغفور بھی جیراجپوری تھے۔ ان حضرات کے درس میں اور ان کی مجلسوں میں کبھی کبھی مولانا اسلم اور ان کے والد مولانا سلامت اللہ صاحب کا ذکر آتا رہتا تھا۔ مولانا حفیظ اللہ صاحب جو اس وقت دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم (پرنسپل) تھے، وہ چونکہ اہلِ حدیث تھے اس لئے ہم عقیدگی کی وجہ سے مولانا سلامت اللہ صاحب سے انھیں بڑی دلچسپی تھی

آگے بڑھ کر جب ذرا اونچی جماعتوں میں پہنچا اور ندوہ کی تاریخ اور مولانا شبلی کے حالات سے واقفیت ہوئی تو مولانا سلامت اللہ اور مولانا اسلم سے واقفیت اور بڑھی۔ تحریک خلافت کے سلسلہ میں جو پُرجوش نظمیں پڑھی جاتی تھیں، ان میں مولانا اسلم کی بھی بعض نظمیں بہت رائج تھیں۔ ان کا یہ مصرعہ

آرہا ہے شوکتِ دینِ محمدؐ پر زوال

لوگوں کو بہت متاثر کرتا تھا۔ اسی زمانے میں ہمارے ایک دوست محمد اکبر صاحب ندوی (لکچرر کلکتہ یونیورسٹی) کے دل میں ایک لہر پیدا ہوئی کہ ندوہ سے جامعہ جانا چاہیے۔ چنانچہ ایک دن صبح جب میں دارالعلوم آیا تو اچانک یہ معلوم ہوا کہ اکبر صاحب رسول بخش صاحب (ندوہ کے ہونہار طالب علم تھے) کے ساتھ دارالعلوم کو علی گڑھ چلے گئے ہیں۔ ایک دوست اور رفیق کار کا ساتھ یکایک چھوٹ جانا کس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے یہ مجھے زندگی میں پہلی بار معلوم ہوا، لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ چار چھ دن کے بعد وہ لوگ پھر ندوہ واپس آ گئے۔ یہ شاید پہلا موقع تھا کہ جامعہ کا نام کان میں پڑا۔ جامعہ کے کاموں کو اور اس کے عالی شان مقاصد کو پورے طور پر اس وقت سمجھنا میرے جیسے طالب علم کے لئے بہت دشوار تھا، لیکن اتنا یاد ہے کہ کچھ جامعہ سے لگاؤ پیدا ہو گیا جو آہستہ آہستہ بڑھتا رہا۔

کچھ عرصے کے بعد رسالہ جامعہ نظر سے گزرا اور مولانا کا نام ایڈیٹر کی حیثیت سے نظر آیا۔ وقتاً فوقتاً ان کے مقالات پڑھنے کا موقع ملا۔ پھر ان کی کتاب تاریخ الامت چھپی۔ ندوہ کے نصاب تعلیم میں مشہور مصری مورخ خضری کی کتاب تاریخ الامم الاسلامیہ داخل تھی۔ مولانا نے اپنی یہ کتاب اسی سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ جیسا کہ دیباچہ میں اظہار بھی کر دیا ہے۔ ہم لوگ اپنی درسی کتاب کو سمجھنے کے لئے اور امتحان کے زمانے میں مطالب پر جلد عبور حاصل کرنے کی غرض سے تاریخ الامت اکثر پڑھا کرتے تھے۔ خضری کی کتاب صرف زوال بغداد تک تھی۔ مولانا نے اپنی کتاب تاریخ الامت کو اس کے بعد کے واقعات سے بھی مزین کیا اور زمانۂ تصنیف تک عالم اسلامی کے تمام حالات درج کر دئے۔ اس طرح یہ کتاب ایک مکمل تاریخ اسلام کے طور پر سارے ملک میں ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور شوق سے پڑھی گئی اور آج بھی جب کہ تاریخ الامت کی اشاعت کو تقریباً پینتیس ۳۵ برس ہو چکے ہیں تاریخ اسلام کے موضوع پر کوئی اتنی جامع اور مکمل کتاب شائع نہیں ہوئی۔

۱۹۳۰ء میں میں جامعہ میں طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوا اور پہلی مرتبہ مولانا سے ملنے کی عزت حاصل ہوئی۔ ہم لوگ چونکہ ایک عربی درس گاہ سے آئے تھے اس لئے اسلامیات کی تعلیم سے مستثنیٰ تھے۔ اس بنا پر مولانا کے درس میں تو شریک ہونے کا موقع نہ ملا، لیکن ویسے جامعہ کی درس گاہ میں بھی اور مولانا کے مکان پر بھی اکثر ملاقات اور گفتگو کا موقع ملتا رہتا تھا۔ تاریخ الامت کے مصنف کی حیثیت سے باہر کے لوگ مولانا کو تاریخ اسلام کا استاد سمجھتے تھے اور خواجہ عبدالحیٔ صاحب کو ان کی تفسیروں کی

وجہ سے قرآن مجید کی تعلیم کا استاد سمجھتے تھے۔ جامعہ آنے سے پہلے میرا بھی یہی خیال تھا، لیکن یہاں آکر معلوم ہوا کہ خواجہ صاحب حدیث شریف کا درس دیتے ہیں اور مولانا اسلم صاحب قرآن مجید پڑھاتے ہیں۔ یہ شاید میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ مولانا اہل حدیث تھے، صرف اپنی ذات ہی سے نہیں بلکہ خاندانی، اس وجہ سے علماء اہل حدیث کے حلقوں میں مولانا کی بڑی وقعت تھی، لیکن وہ روایتی تنگ نظری اور عملی جمود سے کوسوں دور تھے۔ میں نے ان کو آمین بالجہر کہتے یا رفع یدین کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ مولانا کے مطالعہ و ماحول نے انھیں روادار اور وسیع النظر بنا دیا تھا۔ آگے چل کر مولانا کو ان کے مطالعہ نے ذخیرۂ احادیث پر غور کرنے کا خیال دلایا۔ تقلید کی بندش سے وہ بچپن ہی سے آزاد ہو چکے تھے، اب اصطلاحی اہل حدیث بھی نہیں رہے اور قرآن مجید ہی کی جانب ان کی پوری توجہ ہو گئی۔ حافظہ بہت اچھا تھا۔ قرآن مجید کی تفسیر قرآن مجید ہی سے کرنے کا ذوق تھا۔ اس حیثیت سے قرآن مجید کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا اور انھیں قرآن مجید کی مختلف آیات کو ایک دوسرے کی تشریح و تفسیر کے طور پر پیش کرنے میں بڑا کمال حاصل تھا۔ شروع میں جب قرآن مجید کی طرف متوجہ ہوئے تو حدیث کی طرف سے بے اطمینانی کچھ زائد ہوئی اور اس سلسلہ میں رسالہ جامعہ اور دوسرے رسالوں میں جو مضامین لکھے ان میں وہ احتیاط اور متانت نہیں پائی جاتی ہے جس کی مولانا کے مزاج اور طبیعت سے توقع تھی۔ اس زمانہ میں جامعہ کے اندر بھی اور جامعہ کے باہر بھی ان مضامین کے خلاف لوگوں کو ناگواری ہوئی۔ جامعہ کا مسلک واضح کرنے کے لئے خود رسالہ جامعہ میں بعض مضامین شائع ہوئے، بعض ایسے جلسے ہوئے جن میں جامعہ کے اساتذہ اور طلباء کے علاوہ مولانا محمد سورتی جیسے متشدد اہل حدیث شریک ہوئے۔ خیال ہوتا ہے کہ اس جلسہ میں مولانا شرف الدین ٹونکی مرحوم بھی موجود تھے۔ رئیس احمد جعفری نے مولانا کی تردید میں ایک مضمون پڑھا، مولانا سورتی وغیرہ نے زبانی اظہار خیال کیا۔ مولانا احمد اللہ صدر المدرسین مدرسہ رحمانیہ نے تیز لب و لہجہ میں گفتگو کی، مگر مولانا محمد اسلم صاحب مرحوم نے اپنے حسن اخلاق، تحمل اور شائستگی کا اتنا اچھا مظاہرہ کیا کہ لوگ ان کی شرافت نفس اور نیک مزاجی سے بہت متاثر ہوئے۔ رسالہ جامعہ میں جس کے وہ ایڈیٹر تھے رئیس صاحب کا مضمون شائع ہوا۔ رئیس صاحب اس وقت جامعہ کے طالب علم تھے، لیکن مولانا نے اس تنقیدی مضمون پر ذرا بھی اظہار ناگواری نہ کیا، بلکہ جس بزرگانہ شفقت و محبت کے ساتھ پیش آتے تھے اسی طرح برابر پیش آتے رہے، بلکہ شاید رئیس صاحب کے ساتھ ان کی توجہ اور ہمدردی میں کچھ اضافہ ہی ہو گیا۔

اس واقعہ کے بعد رئیس صاحب نے مولانا سے فارسی کی متعدد کتابیں پڑھیں۔ مولانا کی اس عالی ظرفی اور حلم و کرم کا مجھ پر بڑا اثر ہوا۔ آج اس واقعہ کو تقریباً پینتیس۳۵ برس ہو رہے ہیں، لیکن مولانا کے اس خُلقِ عالی کا دل پر ہنوز غیر معمولی اثر ہے۔ ان کی اس اخلاقی مثال نے مجھے اپنی زندگی میں بے انتہا فائدہ پہنچایا اور بارہا اشتعال و دل آزاری کے نازک لمحوں میں ان کی نیک مثال نے صبر و ضبط اور تحمل و رواداری کے کے دائرہ سے نکلنے نہیں دیا۔

عام طور سے کسی آدمی کے حالات سن کر اس کا جو تصور غائبانہ قائم ہوتا ہے، ملنے جلنے کے بعد اس میں فرق آ جاتا ہے، لیکن مجھے مولانا اس عام خیال سے مستثنیٰ نظر آئے۔ ان کی کتابیں پڑھنے اور ان کے مضامین کے مطالعہ سے ان کے متعلق جو خیال میرے دل میں پیدا ہوا تھا انھیں دیکھ کر، ان سے مل کر، ان سے باتیں کر کے، ان کے ساتھ رہ کر، اس سے کہیں زیادہ دل پر اثر قائم ہوا۔ یہ اثر ان کے اخلاق عالیہ ہی کے متعلق نہیں ہوا بلکہ ان کے علمی کمالات بھی ان کی صحبت میں رہ کر معلوم ہوئے۔ مجھے یقین ہے کہ میری طرح جن لوگوں نے بھی مولانا کی صحبت اٹھائی ہے وہ یہی اعتراف کریں گے۔ ان کا علم حاضر، ان کی نظر وسیع، ان کی فکر عمیق اور ان کا مزاج لطیف تھا۔ عربی زبان اور اسلامی و مشرقی علوم پر ان کی اچھی نظر تھی، جو کچھ پڑھا تھا اس پر پورا قابو حاصل تھا، عربی ادب، بلاغت اور معقولات کی اعلیٰ کتابیں سالہا سال سے پڑھانے کا کوئی موقع نہ تھا۔ علی گڑھ اور جامعہ دونوں جگہ ان اونچی کتابوں کا نصاب درس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ عام طور پر ان حالات میں آدمی ان مضامین کو بھول جاتا ہے، لیکن مولانا کی پختگیٔ علم کا یہ حال تھا کہ اگر کبھی مشکل سے مشکل کتاب بھی پڑھانے کا اتفاق ہوتا تو برجستہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ پڑھا دیتے تھے۔ پڑھانے میں ان کا طرز بڑا دل نشین ہوتا تھا، بڑے سے بڑے مسئلے کو چند جملوں میں اس خوش اسلوبی کے ساتھ سمجھا دیتے کہ طالب علم کے ذہن میں پوری بات وضاحت کے ساتھ آ جاتی تھی۔

تیس۳۰ چالیس برس کے قریب انھوں نے درس دیا، لیکن اس طویل عرصہ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کا کورس ختم نہ ہوا ہو یا کسی طالب علم کو یہ شکایت رہی ہو کہ اس کی سمجھ میں بات نہیں آئی۔ جامعہ میں اسلامیات کے کورس کا جن لوگوں کو تجربہ ہے وہ تو یہ جانتے ہی ہیں، لیکن دوسرے آدمیوں کو شاید معلوم نہ ہو کہ اسلامیات کا نصاب اچھا خاصا طویل ہے۔ خطیبانہ ذوق رکھنے والے مدرس شاید نصاب درس کا چوتھائی بھی وقت معین کے اندر ختم نہ کرا سکیں، لیکن یہ مولانا کا کمال تھا کہ وقت مقررہ سے پہلے ہی ان کا کورس پورا ہو جاتا تھا۔

ان کے اس طرز تدریس کا میرے اوپر گہرا اثر پڑا اور طالب علمی ہی کے زمانے سے میں اس طرز کا گرویدہ ہوگیا۔
یہ بات کہنے میں جتنی آسان ہے عمل میں اتنی ہی دشوار ہے، لیکن ایک مدرس کے لئے یقیناً قابل تقلید ہے۔

فضول گوئی مولانا کے مزاج میں بالکل نہ تھی۔ نجی صحبتوں میں بھی، گفتگو میں مخاطب اور حاضرین کے ذوق اور
طبعی مناسبت کو ملحوظ رکھتے اور حتی الامکان کسی ناخوش گوار بات کے ذکر سے پرہیز کرتے۔ مزاج میں خشکی
بالکل نہ تھی، وضع اور لباس میں، طرز معاشرت میں اور کھانے پینے میں بڑی سادگی تھی لیکن اس کے ساتھ
سیر چشمی اور عالی حوصلگی میں کوئی کمی نہ تھی۔

روشن خیالی اور متنور الفکری کے ساتھ دین داری کا اجتماع بہت کم ہوتا ہے۔ لیکن مولانا اسلم
ان چند مستثنیٰ لوگوں میں سے تھے جو روشن خیالی کے ساتھ پورے دیندار تھے۔ کسی بیماری یا مجبوری کی وجہ
سے مسجد نہ جاسکیں تو اور بات ہے، ورنہ مرتے دم تک نماز مسجد میں اور جماعت کے ساتھ پڑھتے رہے۔
عام طور سے علماء ایسے مواقع پر نمایاں اور پیش پیش ہونے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن انھوں نے اس کی
کبھی کوشش نہیں کی، وہ ایک معمولی آدمی کی طرح مسجد میں آتے اور جو بھی امام ہوتا، اس کے پیچھے خاموشی سے
نماز پڑھتے، دخل در معقولات کی بالکل عادت نہ تھی، جب تک کوئی ان سے سوال نہ کرتا وہ از خود دوسروں کی گفتگو
میں مخل نہ ہوتے، سوال کے جواب میں بھی سائل کی استعداد اور ذہنی سطح کا لحاظ رکھتے، کبھی کبھی کہیں سے کوئی
استفتاء آجاتا تو اس کا جواب دیتے، مگر اس میں بھی دیانت داری کا یہ حال تھا کہ سائل کے مذہبی مسلک کا
لحاظ رکھتے۔ پوتے کی وراثت ان کا مجتہدانہ مسلک تھا۔ اس مسئلے پر عربی زبان میں بڑی محققانہ کتاب محجوب الارث
کے نام سے لکھی ہے۔ یہ کتاب ایسی محققانہ ہے کہ ان سے اختلاف رکھنے والے بھی ان کی فکر و تحقیق کے اعتراف پر
مجبور ہیں۔ معارف میں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے اردو میں مولانا کا لکھا ہوا اس کا ترجمہ تین قسطوں میں
شائع کیا۔ اس مسئلے سے ان کی دلچسپی کا یہ حال تھا کہ مرض الموت کے دوران میں بھی اس موضوع پر لکھنے سے
باز نہ رہے، مگر ایک بار باہر سے کسی شخص کا خط آیا، جس میں ایک جائداد کی تقسیم کے سلسلے میں یہی مسئلہ درپیش
شیخ الجامعہ کے یہاں سے یہ خط حسب معمول ناظم دینیات کے پاس بھیج دیا گیا۔ جب یہ خط لئے ہوئے میں کالج گیا
مولانا نے کہا کہ یہ کیا ہے، میں نے یہ خط ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ فرمایا لاؤ میں اس کا جواب لکھ دوں۔ میں
کے مسلک سے واقف تھا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ سائل ایک عام حنفی مسلمان ہے اور حنفی فقہ میں چچا کی موجودگی
بھتیجے کو دادا کی وراثت نہیں ملتی۔ میں نے عرض کیا کہ یہ شخص تو سیدھا سادا حنفی مسلمان ہے۔ فرمایا میں ا-

کوئی اپنے اجتہاد کی تلقین نہیں کروں گا، بلکہ میرا تو یہ قاعدہ ہے کہ سائل کے مسلک کے مطابق جواب لکھ دیا کرتا ہوں۔ خط میں نے مولانا کے حوالہ کر دیا اور مولانا نے اس کا جواب لکھ دیا۔

باہر کے لوگ جنھوں نے مولانا کے مضامین کبھی پڑھے ہیں اور ان سے زیادہ وہ لوگ جنھوں نے دوسروں کی زبانی مولانا کے خیالات سنے ہیں، وہ ان کے سمجھنے میں بہت غلطی کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ سنی سنائی باتوں کی بنا پر انھیں اہل قرآن سمجھتے ہیں اور اہل قرآن سمجھ کر وہ تمام باتیں ان کی طرف منسوب کرتے ہیں جو عبد اللہ چکڑالوی وغیرہ منکر حدیث، متشدد اہل قرآن کہتے تھے، لیکن یہ خیال بالکل صحیح نہیں ہے۔ انھوں نے جا بجا خود اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے اور مختلف مضامین میں اپنے عقائد و خیال کو واضح کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ منکرین حدیث کی طرح وہ اصولاً احادیث کو ناقابل اعتبار نہیں سمجھتے تھے، رسول اللہ صلعم کو امت کا مقتدیٰ مانتے تھے اور آپ کے احکام کو واجب الاتباع سمجھتے تھے۔ وہ صرف یہ بات کہتے تھے کہ احادیث کی جانچ کے لئے قرآن مجید کو معیار قرار دیا جائے، جو روایات قرآن مجید کے موافق ہوں، انھیں تسلیم کیا جائے اور جو آیات الٰہی کے خلاف ہوں انھیں صحیح نہ مانا جائے۔ یہ مسلک کوئی نیا مسلک نہیں ہے۔ اصول حدیث کی تمام کتابوں میں یہ بات لکھی ہوئی ہے اور سلف سے آج تک تمام محدثین کا یہی مسلک ہے۔ البتہ مولانا کے دل میں مختلف وجوہ سے یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ احادیث کی نقل میں راویوں نے احتیاط کم کی ہے، اس سے ان کی نظر میں روایات کا وہ وزن نہ تھا جو جمہور امت کی نظر میں ہے۔ اس لئے روایات کو قرآن مجید سے منطبق کرنے میں جس قدر جمہور کوشش کرتے ہیں ویسی کوشش وہ نہ کرتے تھے اور آسانی سے انھیں نظر انداز کر دیتے تھے۔ البتہ وہ سنت یا عمل متواتر کے پورے طور پر قائل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عام اہل قرآن کی طرح انھیں اپنی دینی زندگی میں اسلامی تعلیم پر عمل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ جمہور مسلمانوں کی طرح پانچ وقت کی نماز پڑھتے رہے، رمضان کے پورے مہینے کے روزے رکھتے رہے، اسی طرح حج کیا ــــ الغرض تقریباً ساری زندگی ایک سیدھے سادے مسلمان کی طرح گزارتے رہے۔ مسائل میں اختلاف رائے کی ادبیات ہے، ورنہ اصولاً اور عملاً ساری زندگی ایک صالح مسلمان کی طرح بسر کرتے رہے، دینی معاملات میں ضرورت سے زیادہ عقل آرائی اور تاویلات بعیدہ کو پسند نہیں کرتے تھے۔ بارہا میں نے ان کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ دین دماغ کی راہ سے نہیں، دل کی راہ سے آتا ہے۔ پرویز صاحب کے عقلی اجتہادات پر اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ مسائل پر اجتہادی نظر کے لئے گہرے علم کی ضرورت ہے۔ قرآنی احکام کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے جصاص کی احکام القرآن اور

شوکانی کی نیل الاوطار پیش نظر رکھنے کی ضرورت سمجھتے تھے۔ پرویز صاحب کو اس طرف توجہ بھی دلاتے رہتے تھے۔ افسوس ہے کہ نہ مخالفین نے انھیں صحیح طور پہ سمجھنے کی کوشش کی، نہ معتقدین نے۔ بلکہ معتقدین کے خیالات اور افکار نے تصحیح خیالات کے بجائے اور بھی ان کی طرف سے بدظنی میں اضافہ کیا۔ وہ قطعی قول رسول صلعم کے منکر نہ تھے بلکہ روایات کو رسول اللہ صلعم کی طرف منسوب کرنے میں بڑے محتاط تھے۔ کہا کرتے تھے کہ قول رسول اور قول منسوب الی الرسول میں بڑا فرق ہے۔ اور ایسا نہ کیا تکلف ہے کہ دونوں میں بڑا فرق ہے۔

لامرکزیت

انفرادیت ہے اقوام و امم کے حق میں موت
ان کے سائے سے بھی ہے اقبال کتراتا ہوا

آہ وہ ملت کہ جو رکھتی نہیں زندہ امام
دمبدم دیکھے گا تو اس پر زوال آتا ہوا

وہ سمجھتی ہے جسے جنت کی راہ مستقیم
راستہ جاتا ہے وہ دوزخ کو بل کھاتا ہوا

دین و دنیا، کچھ نہیں ملتا ہے مرکز کے بغیر
بے سری ملت پہ ہے ادبار منڈلاتا ہوا

اجتماعیت کے اوپر ہے بنا اسلام کی
دیکھتا ہوں میں، ادھر مسلم کو پھر آتا ہوا

ہے رواقِ نیل گوں میں مجھ کو آتا ہے نظر
اپنی ملت کا ستارہ نور برساتا ہوا

مولانا محمد اسلم جیراجپوری

غلام احمد پرویز

وہ مردِ درویش...

غالباً ۳۱-۱۹۳۰ء کا ذکر ہے میں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے متعلق ایک مضمون دیکھا، اس کا بیشتر حصہ خود میرے خیالات کا ترجمان تھا۔ لیکن بعض مقامات ایسے بھی تھے، جن میں مجھے کچھ تردد تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اس موضوع پر اس قسم کا مضمون دیکھا ہو۔ سلجھی ہوئی عبارت، خیالات صاف، اور واضح، سادہ انداز اور الفاظ کم از کم لیکن ہر لفظ اپنے مقام پر منتخب، محکم اور سنجیدہ و برگزیدہ۔ دلائل دلکش، تبحر عالمانہ لیکن اسلوب بحث طالب علمانہ۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ہر دعوے کی تائید قرآن سے۔ مضمون پڑھنے کے ساتھ ہی صاحب مضمون سے ملنے کا شوق دل میں ابھرا، اسی وقت خط لکھا اور تیسرے ہی دن (ایک دوست کی زبانی) اس کا جواب آگیا۔ چنانچہ اتوار کے دن دوپہر کے وقت قرول باغ پہنچا۔ قرول باغ اس زمانے میں مختصر سی بستی تھی اور زیادہ تر جامعہ ملیہ کی وجہ سے مشہور۔ چنانچہ وہاں چھپر والے کنویں کو تلاش کرنے میں زیادہ دقت نہ ہوئی، مکان پر پہنچا، دستک دی، دروازہ کھلا تو خود صاحب خانہ (اور صاحب مضمون) میرے سامنے تھے، بلند قامت، سر کے بال قریب قریب سفید، لیکن مانگ نکلی ہوئی، کھچڑی داڑھی لیکن تراش موزوں، کھاسے کا کرتا اور گاڑھے ہی کا پاجامہ، ازاربند کرتے سے نیچے لٹکا ہوا اور اس میں ایک چابی بندھی ہوئی، پاؤں میں دیسی جوتا، پیشانی کشادہ، ایک آنکھ کی سیاہی ذرا اپنے مقام سے ہٹی ہوئی، لبوں پر مسکراہٹ، اور چہرے پر بشاشت اور متانت کا ایسا امتزاج جو خیالات کی پاکیزگی اور حسنِ ذوق کا آئینہ دار۔ میں نے اپنا نام بتایا تو بڑے شفقت آمیز انداز سے اندر آنے کے لئے کہا، کمرے کے اندر پہنچے تو مکان کے مکین کی سادگی کا منظر۔ سامنے ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی، جس پر لکڑی کا ایک چھوٹا سا

یہ مضمون طلوعِ اسلام (کراچی) کی جنوری ۱۹۵۶ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔

ڈیسک تھا اور اس پر لکھنے پڑھنے کا مختصر سا سامان --- قلم دوات، تھوڑے سے کاغذ لے اسی چٹائی پر
بیٹھ گئے اور دو ہی چار باتوں کے بعد ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ہم مدتوں کے ملاقاتی ہوں۔ ان کی
باتوں کا بھی وہی انداز تھا جو تحریر کا تھا، مختصر، جامع، دل نشین، صاف، واضح اور شگفتہ، جن میں
سادگی کے ساتھ عجیب قسم کا معصومانہ انکسار بھی تھا، قرآن --- سینے، دل اور دماغ تینوں میں،
کتب روایات و سیر پر عبور، تاریخ امم بالخصوص مسلمانوں کی تاریخ پر گہری نظر، شعر کا ذوق نہایت پاکیزہ،
مذکورہ صدر مضمون کے اختلافی مقامات کے متعلق گفتگو رہی، میرے اعتراضات میں، بہ تقاضائے عمر،
(میں اس وقت ۲۶، ۲۷ برس کا تھا) شدت اور جوش تھا، ان کے جواب میں نرمی اور متانت، باتیں
ہو رہی تھیں کہ دو تین حضرات ملنے کے لئے آ گئے، ان میں ایک تو مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم اور
ایک صاحب بمبئی کونسل کے ممبر اور تیسرے صاحب کسی ریاست کے عہدیدار، انھیں بھی اسی بے تکلفی
سے چٹائی پر بٹھا دیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم تو مولانا چائے پینے کے لیے آئے ہیں۔ مسکرا کر کہا کہ یہ کوئی نئی
بات نہیں، یہ کہہ کر خود ہی اندر گئے (گھر میں ملازم کوئی نہیں تھا) پہلے ایک دسترخوان لا کر بچھا دیا جو
بتا رہا تھا کہ وہ گاڑھے کے پرانے کرتوں کو جلا کر تیار کیا گیا ہے، پھر چار پانچ پرچیں پیالیاں (جن میں
شاید ہی کوئی صحیح سالم ہو) ایلومینیم کی چائے دانی۔ میں ان چیزوں کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا
کہ اس تکلف کے دور میں اس قدر سادگی کے لئے کتنے بڑے وسیع ظرف اور بلند نگاہ کی ضرورت ہے۔
یہ تو تھا چائے کا سامان، لیکن جب صاحب خانہ نے چائے پر گفتگو شروع کی تب معلوم ہوا کہ
آنے والوں نے خاص طور پر چائے کی فرمائش کیوں کی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی (غبار خاطر
میں) اپنی چائے کی رنگینی اور گرم جوشی کا بڑا حسین نقشہ کھینچا ہے، لیکن چائے کا جو نقشہ یہاں
کھینچ رہا تھا، اس میں اور غبار خاطر کے نقشے میں اتنا ہی فرق سمجھئے جتنا فرق بادیہ نشین عربوں کے قہوہ
نخلستانی اور عجمی محفلوں کے بادۂ ارغوانی میں ہوتا ہے۔ گفتگو میں عربوں کی سی سادگی، بے تکلفی،
سینہ کی کشادگی، ذوق کی پاکیزگی اور شگفتگی، ابل ابل کر سامنے آ رہی تھی، حتیٰ کہ لطائف بھی عربی کتب
محاضرات ہی کے تھے۔ قریب ایک گھنٹے تک یہ محفل گرم رہی --- وہ محفل جس میں خلوص کی پہنائیاں،
علم کی گہرائیاں اور ذوق کی بلندیاں سب سمٹ کر آ گئی تھیں۔
یہ تھی علامہ اسلم جیراجپوری سے میری پہلی ملاقات۔ دنیا میں خیالات کی ہم آہنگی کا رابطہ بھی

عجیب رابطہ ہے اور جب اس ہم آہنگی کی بنیاد قرآن پر ہو تو پھر اس قلبی تعلق کا پوچھنا ہی کیا۔ (یہ میرا عمر بھر کا تجربہ ہے کہ جن لوگوں سے قرآن کی بنیادوں پر تعلق پیدا ہوا، وہ رشتہ بڑا ہی محکم رہا۔) چنانچہ چند ہی دنوں کے بعد صورت یہ ہو گئی کہ میری فرصت کے بیشتر اوقات ان ہی کے پاس گزرنے لگے۔ اس زمانے میں ہمارے دفاتر چھ ماہ کے لئے (سردی میں) دہلی رہا کرتے تھے اور گرمیوں کے چھ مہینے شملہ میں۔ گرمی کے موسم میں جامعہ میں کم و بیش تین ماہ کی تعطیلات ہو جاتیں اور مولانا اپنے وطن تشریف لے جاتے۔ میں عربی ادب کی بعض کتابوں میں ناپختگی محسوس کیا کرتا تھا۔ میں نے چاہا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا لوں اور عند الفرصت مولانا سے یہ کتابیں از سر نو پڑھ لوں، چنانچہ (غالباً) ۱۹۳۵ء میں میں نے اس کے متعلق مولانا سے ذکر کیا اور وہ اس کے لئے بخوشی رضامند ہو گئے، چنانچہ میں شملہ سے تنہا دہلی آگیا اور چونکہ مولانا بھی اس زمانے میں اکیلے ہی رہتے تھے، اس لئے فیصلہ یہی ہوا کہ میں ان ہی کے ساتھ رہوں۔ یہ چھ مہینے کا عرصہ میری زندگی کے یادگار دنوں میں سے ہے۔ میں آیا تو تھا عربی ادب کی ناپختگی دور کرنے کے لیے، لیکن ہمارا بیشتر حصہ قرآن کے رموز و غوامض پر بحث و تحقیق میں گزرتا۔ اس زمانے میں مولانا کا ایک ملازم تھا رحمت اللہ، وہی روٹی پکاتا تھا (بلکہ اسے روٹی پکانا میں نے ہی سکھایا تھا) اور مولانا کا چھوٹا لڑکا (عزیزی معظم سلمہ اللہ تعالیٰ جو اس زمانہ میں طبیہ کالج میں پڑھتا تھا اور اب اعظم گڑھ میں ایک کامیاب طبیب ہے) یہ ساتھ تھے۔ اوپر کے کمرے میں میری اور مولانا کی چارپائی آمنے سامنے بچھی رہتی، رحمت اللہ مولانا کو حقہ بھر کر دے جاتا اور ہم باتوں میں مصروف رہتے۔ ان باتوں کا محور تو ظاہر ہے قرآن ہوتا لیکن شاید ہی کوئی ایسا موضوع تھا جو اس محور کے گرد نہ گھومتا ہو۔ اس زمانے میں (اپنی تصنیف) معارف القرآن کے ابتدائی مراحل سے گزر رہا تھا، اس لئے میرے پیش نظر بھی ہر وقت قرآن رہتا تھا اور مولانا کے تو سینے ہی میں قرآن تھا۔ نہ معلوم اس چھ ماہ کے عرصے میں ہم نے قرآنی تحقیق کے ضمن میں کتنا کچھ کھنگال ڈالا۔ میں نے اپنی حیثیت ہمیشہ ایک شاگرد کی سی سمجھی، لیکن مولانا کی کشادہ نگہی کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے مسئلے پر بھی انھوں نے اگر دیکھا کہ میری رائے صحیح ہے تو اسے وہ ایسی خندہ پیشانی سے قبول کر لیتے کہ بعض اوقات مجھے شبہ گزرنے لگتا کہ وہ کہیں میرے پاس خاطر سے ایسا تو نہیں کرتے لیکن بعد کے تجربے نے بتایا کہ دین کے معاملہ میں مولانا کسی کے پاس خاطر سے نہ کوئی بات قبول کرتے ہیں، نہ کوئی خیال چھوڑتے ہیں، وہ اختیار صرف اسے کرتے ہیں جسے حق سمجھتے ہیں اور اگر کسی بات کے متعلق تحقیق ہو جائے کہ وہ قرآن

کے مطابق نہیں تو اسے نہایت جرأت اور آسانی سے جھٹک کر الگ کر دیتے ہیں۔ اس قیام کے دوران میں مولانا کا علمی تبحر، قرآن سے عشق اور سب سے بڑھ کر ان کی سیرت و کردار کی بلندی نکھر کر میرے سامنے آگئی۔ میں نے دیکھا کہ بذریعہ ڈاک استفسارات کے علاوہ ممالک اسلامیہ کے جید علما اور مشاہیر اکثر ان سے ملنے کے لیے آتے اور اہم مسائل میں ان سے استفادہ کرتے۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ اگرچہ حدیث کے متعلق ان کا مسلک اہل حدیث سے مختلف تھا اور فقہ کے متعلق ارباب فقہ سے الگ، لیکن اہل حدیث اور اہل فقہ کے بڑے بڑے علمار اس انداز سے آپ کے پاس آتے جیسے کوئی شاگرد استاد کے پاس یا کوئی خورد اپنے بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ ملت اسلامیہ کا درد ان کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھا۔ مصر ہو یا حجاز، شام ہو یا ترکی، ایران ہو یا ہندستان، کہیں مسلمانوں پر کوئی آفت آئے، مولانا مضطرب اور پریشان ہو جاتے اور ان کی خیر طلبی کی دعائیں مانگنے لگتے۔ ان کا معمول یہ تھا کہ وہ رات کو تین بجے کے قریب اٹھتے، تہجد پڑھتے، حفظ کردہ قرآن کی منزل دہراتے، اس کے بعد نہایت عجز و الحاح سے دعائیں مانگتے، اپنے لئے قرآن سمجھنے اور قرآن پر چلنے کی دعا اور باقیوں کے لئے اس عمومی دعا کے علاوہ ان کی پریشانیاں دور ہونے کی دعائیں، افراد کے بعد ملت کی اجتماعی بہبودی کے لیے دعائیں مانگتے، اور پھر بحمداللہ کے حضور ایک خاص سجدۂ شکرانہ ادا کرتے، جس میں نہایت عجز اور مسرت سے کہتے کہ مجھ سے زیادہ اس دنیا میں خوش نصیب کون ہو سکتا ہے، جسے اے میرے پروردگار! تیرے سوا نہ دنیا میں کسی کی محتاجی ہے نہ کسی کا ڈر، وہ اس دوران میں مجھے کبھی نہ جگاتے، سمجھتے کہ میری عمر ابھی سونے کی ہے، لیکن میں نیم بیدار نیم خفتہ بستر میں پڑا رہتا، تاکہ ان کے تخلیہ میں خلل انداز نہ ہوں، اس کے بعد وہ تھوڑی سی ورزش کرتے اور مجھے آواز دیتے کہ صبح کی نماز کا وقت ہو گیا ہے، مکان سے ملحقہ مسجد میں نماز کے لیے جاتے۔ وہاں کا امام عام پکی روٹی والا امام تھا، لیکن مولانا ہمیشہ اس کے پیچھے نماز پڑھ لیتے مجھے کبھی کبھی اس کا خیال بھی آتا، لیکن وہ ہمیشہ یہ کہہ کر روک دیتے کہ یہ امام محلہ والوں کا منتخب کردہ امام ہے، اس لئے نماز اسی کو پڑھانی چاہیئے۔ نماز سے واپسی پر چائے ملتی، وہ پیالی چائے (خواہ کسی برانڈ کی ہو بلکہ برانڈ کا لفظ تو میں نے استعمال کیا ہے، وہاں کبھی برانڈ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا) اور اس کے ساتھ ایک پیسے والا نان پاؤ۔ یہ ہوتا عام طور پر ان کا ناشتہ۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، چائے کا وقت تو ان کے (غالب کے الفاظ میں) "شگفتن گلہائے ناز" کا وقت ہوتا۔ میں اس زمانے میں چائے نہیں پیتا تھا

ناشتے، چائے کے وقت سب سے پہلا موضوع میری یہی "کم نصیبی" ہوتا، اس کے ساتھ ہی دلچسپ لطائف، نت محاضرات کے شہ پارے، عربی و فارسی اور اردو کے نہایت پاکیزہ اور بلند پایہ اشعار، بعض اوقات خود اپنے (پرانے) اشعار بھی (کیونکہ اس زمانہ میں شعر کہنا چھوڑ دیا تھا) چائے کے بعد حقہ کی ایک چلم، پھر وہ جامعہ تشریف لے جاتے اور میں دفتر آ جاتا۔

مولانا کی درویشی کا یہ عالم تھا کہ وہ علی گڑھ کالج کی پروفیسری کو چھوڑ کر جامعہ آئے تھے (جامعہ میں چھوٹے بڑے سب ان کی دل سے عزت کرتے تھے اور ان کا نام بڑی عقیدت و احترام سے لیتے ہیں سمجھتا ہوں کہ عزت و عقیدت کے بجائے محبت کا لفظ اس کیفیت کا زیادہ بہتر ترجمان ہوگا) جامعہ پر اس زمانے میں بڑی عسرت کا دور تھا، ویسے تو وہاں تمام اساتذہ کا مشاہرہ اسی روپے ماہوار مقرر تھا لیکن مالی دشواریوں کی وجہ سے ملتے صرف چالیس ہی تھے۔ ایک وقت وہ بھی آیا کہ یہ چالیس بھی کئی مہینوں تک نہ مل سکے۔ میں نے مولانا کو اس زمانے میں بھی کبھی پریشان نہ دیکھا۔ مجھ پر اس کا اثر تھا، لیکن ان پر اس کا مطلقاً کوئی اثر نہیں تھا، وہ بالکل ویسے ہی مطمئن اور شاداں و فرحاں زندگی بسر کرتے، وہ جو اقبال نے کہا ہے کہ

با اضطراب موجِ سکونِ گہر بدہ

میں نے مولانا کے قلب کو اس کا صحیح مظہر پایا۔ انھوں نے اپنی زندگی کو اس قدر ہموار رکھا تھا کہ جس مقام پر لوگ عسرت محسوس کرنے لگتے ہیں، وہ ان کی زندگی کا معمول بن چکا تھا، لیکن یہ ٹھاٹھ بخل کی وجہ سے نہ تھا بلکہ سیر چشمی اور مومنانہ استغنا کی بنا پر تھا۔ ان کی آمدنی کا بیشتر حصہ مستحقین کی امداد میں صرف ہوتا تھا اور وہ اس کا کسی کو علم تک بھی نہیں ہونے دیتے تھے اور اس امداد کی بعض شکلیں بھی عجیب ہوتی تھیں، مثلاً ایک دفعہ کا ذکر ہے، ایک شام کو میں ان کے یہاں پہنچا تو کھانے کا وقت تھا، سالن میں شلغم تھے معظم میاں کو شلغم ناپسند تھے آلو بہت پسند تھے (جب میں وہاں ٹھہرا ہوا تھا تو "کیا پکے گا" کے مسئلہ پر اکثر میں اور معظم اکثریت میں ہوتے اور مولانا اقلیت میں رہ جاتے) میں نے پوچھا کہ کیا معظم یہاں نہیں ہیں جو آج شلغم پک رہے ہیں؟ ہنس کر کہا کہ نہیں۔ ان کے شلغموں کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔ تم نے نیچے بڑے میاں کو دیکھا ہے، یہ جہلم کے رہنے والے ریٹائرڈ فوجی سپاہی ہیں۔ دو چار دن ہوئے ملازمت کی تلاش میں آ گئے۔ میں نے پوچھا بڑے میاں روٹی پکانا جانتے ہو۔ کہنے لگے کہ جی ہاں، فوجی سپاہی کو کیا نہیں آتا۔ میں نے کہا کہ اچھا ہماری روٹی پکا دیا کرو۔ لیکن میں نے دیکھا کہ اسے روٹی سالن کچھ بھی تو پکانا نہیں آتا۔ جب میں نے کہا کہ میاں،

یہ کام تو تجھ سے نہیں ہو سکے گا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے اپنی درد بھری داستان سنائی کہ جسے سننے کے بعد اسے الگ کر دینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوا۔ اب یہ روز کوئی نہ کوئی دلچسپ بات کر دیتا ہے۔ آج صبح میں نے کہا کہ بڑے میاں تمھیں کوفتہ پکانا آتا ہے۔ کہنے لگا، کوفتہ کوفتہ، گول گول۔ میں نے کہا ہاں، گول گول۔ کہنے لگا پکالوں گا۔ اب جو شام کو کھانا سامنے آیا تو اس میں شلغم ہیں۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگا یہی تو ہیں گول گول گونگلو (پنجاب میں شلغم کو گونگلو کہتے ہیں) یہ کہہ کر مولانا کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ اس کے بعد بڑے میاں خود ہی ملازمت چھوڑ کر کہیں چلے گئے، مولانا نے کبھی ایک لفظ بھی ترش روئی سے نہیں کہا، اس نے جو کچھ پکا دیا، ہنس کر کھالیا۔

ویسے تو مجھے بہت سے واقعات یاد ہیں، جن سے مولانا کی وسعتِ ظرف اور بلندئ سیرت کا اندازہ ہو سکتا ہے، لیکن ان میں ایک واقعہ ایسا ہے جس کے نقوش میرے دل کی گہرائیوں میں اترے ہوئے ہیں۔ ایک دفعہ مولانا نے ہندوستان کے ایک نامور اہلِ قلم کی کتاب پر تبصرہ لکھا، جس میں بتایا کہ اس کتاب میں کئی باتیں قرآن کے خلاف ہیں۔ یہ تبصرہ ان پر ذرا سخت پڑا۔ اس زمانے میں خود مولانا کی ایک کتاب زیرِ طباعت تھی جس کا چرچا علمی حلقوں میں پہلے ہی سے ہو رہا تھا۔ ان صاحب کے مجھ سے بھی مراسم تھے، وہ میرے پاس آئے اور مولانا کی کتاب کو ایک فتنۂ عظیم قرار دے کر کہا کہ میں اس کے خلاف لکھوں۔ میں نے کہا کہ میں جب تک اس کتاب کو دیکھ نہ لوں اس وقت تک اس کے خلاف کس طرح لکھ سکتا ہوں۔ انھوں نے بہت اصرار کیا، لیکن میں اس پر آمادہ نہ ہوا، جب وہ مجھ سے مایوس ہو گئے تو وہ جامعہ میں پہنچے اور وہاں اس (آنے والی) کتاب کے خلاف محاذ قائم کرنے کی کوششیں شروع کیں اور وہ اس حد تک کامیاب بھی ہو گئے کہ وہ کتاب مکتبہ جامعہ کی طرف سے شائع نہ ہو۔ یہ سب کچھ مولانا کے علم میں تھا، لیکن میں نے دیکھا کہ مولانا نے ان کے متعلق نہ ان سے کبھی ایک حرف کہا اور نہ ہی ان کے ساتھ اپنے تعلقات میں کوئی فرق آنے دیا۔ یہ سب کچھ انھوں نے ظاہر داری کے طور پر نہیں کیا تھا، اس لئے کہ ظاہر داری مولانا کی طبیعت کے یکسر خلاف تھی۔ ان کے دل میں فی الواقع ان صاحب کے خلاف کوئی ملال نہیں تھا، اس لئے کہ اس کے بعد کئی مرتبہ یہ واقعہ زیرِ گفتگو آیا اور مولانا ہمیشہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے کہ وہ معذور ہیں، ان کی طبیعت ہی ایسی ہے۔ ان کے علاوہ کئی اور لوگ بھی تھے جو آئے دن مولانا کے خلاف کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے اور ان میں بعض نہایت پست سطح پر بھی اتر آتے، لیکن میں نے ان میں سے کسی کے خلاف مولانا کی زبان سے

ایک لفظ بھی سختی کا نہیں سنا۔

یوں تو اس عرصہ میں مولانا سے ہر ملاقات ایک نہ ایک اثر چھوڑ جاتی تھی، لیکن شروع جنوری ۱۹۳۸ء
میں لاہور کا سفر ایک یادگار واقعہ ہے۔ انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ کے زیر اہتمام لاہور میں (غالباً پہلا)
"یوم اقبال" منایا گیا اور اس میں شرکت کے لئے احباب دہلی کا قافلہ مولانا کی زیر قیادت روانہ ہوا۔ افراد
کارواں میں راقم الحروف کے علاوہ محترم اسد ملتانی، شیخ سراج الحق اور ہمارے ایک مرحوم دوست
قاضی محمد اشرف تھے۔ یوم اقبال کے اجتماعات میں شرکت کے علاوہ خود علامہ اقبال سے (ہماری آخری)
ملاقات زندگی کے ناقابل فراموش لمحات میں سے تھی۔ اس تقریب اور اس ملاقات کا حال خود مولانا نے
بھی ایک مضمون میں قلم بند فرمایا تھا، جو غالباً رسالہ نیرنگ خیال کے اقبال نمبر میں شائع ہوا تھا۔ نیز علامہ
اقبال سے اس آخری ملاقات کی روداد میں نے بھی ایک مقالے میں محفوظ کر لی تھی جو طلوع اسلام میں شائع
ہوا تھا۔ ۱۹۳۸ء "طلوع اسلام"، شائع ہوا تھا تو مولانا نے اسے اپنی خصوصی قلمی اعانت سے نوازا۔
جب جامعہ اوکھلا میں چلا گیا تو صورت یہ رہتی تھی کہ جمعہ کے روز (جب جامعہ میں چھٹی ہوتی) مولانا میرے
ہاں تشریف لے آتے اور اتوار کے دن میں معہ اپنے دیگر احباب کے، جو مولانا سے بھی اتنے ہی قریب تھے،
جتنے مجھ سے، اوکھلا چلا جاتا۔ یوں تو مولانا کے ملنے والوں کا حلقہ بہت وسیع تھا، جس کی وسعتیں
ہندوستان سے باہر تک پھیلی ہوئی تھیں، لیکن جو خصوصی اور قلبی تعلق انہیں اس حلقۂ احباب سے تھا
وہ شاید کسی اور کے حصہ میں نہ آیا ہوگا۔ اس اعتبار سے اس حلقۂ احباب کی مجلس ایک خاص رنگ لئے
ہوتی تھی۔ اتوار کی دوپہر، باہر دھوپ میں چارپائیاں بچھ جاتیں، دریا کی تازہ مچھلی آجاتی، کڑھائی چڑھ
جاتی، مچھلی تلی جا رہی ہے اور اہم ترین مسائل و حقائق پر گفتگو ہو رہی ہے، احباب میں بے لوث تعلق،
قلبی یگانگت، مخلصانہ محبت، خیالات میں یک رنگی، ذوق کی ہم آہنگی، باہمی کوئی راز نہیں، درمیان میں
کوئی پردہ حائل نہیں، کسی قسم کی مغائرت نہیں، ایک دوسرے کو کسی غلط فہمی کا اندیشہ نہیں، فرق
مراتب ضرور ملحوظ رکھا جاتا، لیکن مولانا نے اپنے آپ کو کبھی باقی احباب سے بڑا محسوس نہیں ہونے دیا۔
ان محفلوں کے متعلق میرے ہی نہیں بلکہ دیگر احباب کے بھی یہ تاثرات تھے کہ مولانا کی موجودگی میں دل کو ایک
خاص قسم کا انبساط اور سکون حاصل رہتا تھا۔ محفل کیا حقائق و لطائف کی سمٹی ہوئی دنیا ہوتی۔ گفتگو
نہایت متین لیکن شگفتہ و شاداب، پُر مغز لیکن صاف اور سادہ، ٹھوس لیکن رواں اور شیریں، موضوع

ہمیشہ واقعات اور اشیاء سے متعلق ہوتے، ذاتیات ان میں کبھی نہ آنے پاتیں۔ اگر کسی کی ذات درمیان میں آ بھی جاتی تو نہ کسی کی بے جا تعریف ہوتی، نہ ناحق تنقیص۔ مولانا کا حافظہ اتنا قوی تھا کہ واقعات کی جزئیات اس طرح بیان کئے جاتے جیسے کتاب پڑھ کر سنا رہے ہوں۔ یہ محفلیں درحقیقت ہماری درس گاہ تھیں ــــــــ اور اب محسوس ہوتا ہے کہ حاصلِ زیست بھی۔

اسی دوران میں میری کتاب معارف القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی، جس کا مقدمہ مولانا نے بکمال عنایت خود تحریر فرمایا۔ اس کے بعد اس کی دوسری اور تیسری جلد بھی دہیں (ہندوستان میں) شائع ہوئی۔ قرآنی تحقیق کے اس تمام دشوار گذار مراحل میں مولانا کی رفاقت اور شفقت میرے لئے ہر مقام پر درجہ تقویت رہی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اسے ان کی طرف سے حوصلہ افزائی کہوں یا غایتِ شفقت کہ جب لوگ ان کے پاس آتے تو آپ میری طرف اشارہ کر دیتے۔ میں نے کئی مرتبہ عرض کیا کہ آپ کی موجودگی میں مجھے لب کشائی کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ ایک مرتبہ میرے زیادہ اصرار پر فرمایا کہ قرآن کو بہتر طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے سامنے اپنے زمانے کے تقاضے ہوں۔ تم اس دور کے تقاضوں کو بہتر سمجھتے ہو، اسی لئے قرآن کو سمجھ بھی سکتے ہو اور سمجھا بھی، اس لیے یہ فریضہ اب تمھیں ادا کرنا ہوگا۔ آپ غور فرمائیے کہ اس قسم کا کشادہ ظرف، وسعتِ قلب اور بلند نگہی قرآن کے علاوہ اور کون سی چیز پیدا کر سکتی ہے؟ اتنا ہی نہیں، کئی مسائل ایسے بھی آ جاتے جن میں مجھے ان سے اختلاف ہوتا، وہ ان مقامات پر مجھے ٹوکتے، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ انھوں نے اپنے خیال کو مجھ پر زبردستی ٹھونسنے کی کوشش کی ہو۔ وہ دلائل و براہین سے مجھے سمجھانے کی کوشش فرماتے، لیکن اگر اس کے باوجود میں کہہ دیتا کہ میرا اس سے اطمینان نہیں ہوا تو ملتھے کی شکن تو ایک طرف دل کی گہرائیوں میں اس کے متعلق کسی قسم کی کبیدگی پیدا نہ ہوتی۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ ان کی موجودگی میں کسی نے مجھ سے کسی ایسی بات کے متعلق پوچھ لیا جس میں ان کا خیال مجھ سے مختلف تھا، میں نے اپنے خیال کے مطابق بات سمجھانی شروع کر دی، مولانا نہایت خاموشی سے سنتے رہے اور حقہ پیتے رہے، کبھی مداخلت نہیں کی، لیکن جب میں مستفسر سے کہہ دیتا کہ اس باب میں مولانا کا خیال کچھ اور ہے اور وہ ان کی طرف رجوع کرتا تو پھر آپ پوری وضاحت سے اپنے خیال کو پیش کرتے۔

مولانا سے اخذِ فیض کا یہ حسین، سادہ و رنگین سلسلہ اسی طرح جاری تھا کہ تقسیم ہند کا زمانہ آگیا۔

میں اور اس حلقے کے دیگر احباب اس زمانے سے "پاکستانی" واقع ہوئے تھے جب ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال نے اپنے الہ آباد کے خطبۂ صدارت میں اس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ لہٰذا ہمارے لیے تشکیل پاکستان جن مسرتوں اور شادمانیوں کا موجب ہو سکتی تھی وہ ظاہر ہے، لیکن اس ہجوم مسرت میں یہ خیال ہم سب کے لیے وجہ ہزار اضطراب تھا کہ مولانا پاکستان نہ جا سکیں گے۔ اس خیال سے بالخصوص جو کچھ میرے دل پر گزرتی تھی، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بہرحال یہ افراد کارواں خون کی ندیاں پیرتے اور آگ کی خندقیں پھاندتے کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچ گئے، لیکن مولانا وہیں رہ گئے۔ اتنے برسوں کے بعد مولانا سے اس طرح علیحدگی کا یہ پہلا موقع تھا، اس لیے مجھے ان کی کمی ہر سانس میں محسوس ہو رہی تھی۔ مولانا نے میرے اس اضطراب کو محسوس فرمایا اور ان کا کرم ملاحظہ فرمائیے کہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد وہ میرے پاس (کراچی) تشریف لے آئے اور اس طرح پھر سے میرے گھر کی تاریکیاں نور سے بدل گئیں اور دلّی کی محفلیں پھر سے تازہ و سرسبز ہو گئیں، لیکن مولانا کا یہ آنا عارضی تھا، اس لیے کچھ عرصے کے بعد وہ واپس تشریف لے گئے۔

میں نے یہ کوائف مارچ ۵۸ء میں لکھے تھے۔ اس کے بعد مولانا صاحب موسم گرما کی تعطیلات میں اپنے وطن (چیراج پور ضلع اعظم گڑھ) تشریف لے گئے۔ اگست میں واپس دہلی تشریف لائے تو طبیعت ناساز ہو گئی، ستمبر میں انھوں نے مجھے اطلاع دی کہ "پندرہ دن سے دورہ میں مبتلا ہوں، سانس پر دباؤ پڑتا ہے، تنفس میں تکلیف ہوتی ہے، علاج ہو رہا ہے، بہت افاقہ ہے، اللہ کا شکر ہے، بلڈ پریشر کی بھی کچھ شکایت ہے، کچھ قلب کی بھی کمزوری ہے، اب زیادہ تردد کی بات نہیں، حالت بہتر ہے۔" پھر ۲۲ اکتوبر کو اطلاع دی کہ "بیماری قلب کی ہے، کمزوری بہت ہو گئی ہے، احباب سے کہیے کہ میری شفا کے لئے دعا کریں۔" ۲۰ اکتوبر کو لکھا کہ "الحمد للہ میں بتدریج اچھا ہو رہا ہوں۔ حرکت کی ابھی اجازت نہیں۔" ۱۲ نومبر کو اطلاع دی کہ "جب سے مرض کا حملہ ہوا ہے کمرہ سے باہر نہیں اترا ہوں، کمزوری ہے، رات اور دن سکون اور اطمینان سے گزرتے ہیں، امید ہے کہ صحت جلد ہو جائے گی۔" ۲۴ نومبر کے خط میں بھی یہی کیفیت لکھی۔ ۱۶ دسمبر کے خط میں لکھا کہ "میں دن بہ دن روبہ صحت ہوں، لیکن قلب کی بیماری ہے اس وجہ سے صحت بہت دیر سے ... ویسے کوئی تکلیف نہیں، مگر حرکت سخت دشوار ہے۔ اللہ کا شکر ہے۔" یہ آخری خط تھا، جس کے بعد ۲۹ دسمبر کو مجھے اطلاع ملی کہ وہ قلب متحرک ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا اور اس طرح میری دوبارہ ملنے کی آرزوئیں خ... شدہ حسرت بن کر رہ گئیں۔

ڈاکٹر اطہر پرویز

ایک عالِم — ایک انسان

مولانا اسلم جیراج پوری کا نام بچپن سے سنتا آیا تھا لیکن جب مئی ۱۹۵۰ء میں جامعہ نگر پہنچا تو وہاں ایک فرشتے سے ملاقات ہوئی۔ معلوم ہوا کہ ان کو ہی مولانا اسلم جیراج پوری کہتے ہیں۔ اس کے بعد آج تک یہ حال ہے کہ جب میں مولانا اسلم جیراج پوری کے بارے میں سوچتا ہوں تو ایک فرشتے کی شکل آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے اور جب کبھی فرشتے کا خیال آتا ہے تو مولانا اسلم جیراج پوری ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ بلاشبہ مولانا اسلم ان لوگوں میں سے تھے جو نلک کے برسوں پھرنے کے بعد خاک کے پردے سے نمودار ہوتے ہیں۔

مجھے جن چند انسانوں کو دیکھ لینے پر ناز ہے، ان میں سب سے نمایاں مولانا اسلم تھے۔ میں ان کے مکان کے سامنے رہتا تھا — برسوں آنا جانا رہا، برسوں ملنا جلنا رہا — جب تک وہ زندہ تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ہم سانس لے رہے ہیں اور جب ان کا جنازہ اٹھا تو دم گھٹتا محسوس ہوا۔

میں جب جامعہ گیا تو اُس وقت مولانا کی عمر لگ بھگ ۶۸ سال تھی۔ میں نے بہتیرے روشن خیال لوگوں کو دیکھا ہے لیکن مولانا کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اتنا بوڑھا آدمی اتنا روشن خیال کیسے ہو سکتا ہے! حقیقت یہ ہے کہ لوگ بڑے سے بڑے انقلاب پسندوں کو برداشت کر لیتے ہیں۔ مذہب کے معاملے میں کتنے ہی قدامت پسند کیوں نہ ہوں، دوسرے مذہب کے عقیدت مندوں کو گوارا کر لیتے ہیں، لیکن اپنے مذہب کے روشن خیال انسانوں کو برداشت کرنا بہت مشکل ہے۔ سرسید کے لئے یہی روشن خیالی ایک بلا ثابت ہوئی اور آج بھی صورت حال کم و بیش یہی ہے۔ مولانا اسلم کے یہاں ایسا کوئی خانہ نہیں تھا۔ مولانا اسلم کے عقائد کے بارے میں ہندستان و پاکستان کے

....

تمام اہلِ علم واقف ہیں لیکن مولانا کے یہاں جو روشن خیالی تھی اس سے وہی لوگ واقف ہوں گے، جن کا اُن سے واسطہ پڑا ہو۔ مولانا سے تعلقات رکھنے کے سلسلے میں خیالات اور نظریات کو بڑی اور کڑی آزمائشوں سے کبھی نہیں گزرنا پڑا۔

مولانا ایک عالم باعمل تھے۔ ان کو دیکھ کر انسان کا ایمان پختہ ہوتا تھا۔ ان کے پڑوس میں رہنے سے جو بات سب سے نمایاں نظر آتی تھی، وہ ان کی بچوں سے محبت تھی۔ پنڈت نہرو تو بچوں سے محبت کرنے کے معاملے میں مشہور تھے ہی لیکن ان کا بچوں کا سابقہ کبھی کبھار کا تھا۔ جلسوں اور تقریبات کے موقع پر اس کا اظہار ہوتا تھا۔ ایک خاص طبقے کے بچوں کو ہی ان سے ملنے کی سعادت حاصل ہوتی تھی لیکن مولانا کا تو یہ روزمرہ تھا۔ تاباں صاحب کے بچوں سے لے کر چندی دھوبی تک کے بچے تک ان کو گھیرے رہتے تھے اور وہ اپنی محبت بلا تخصیص ہر ایک پر نچھاور کرتے رہتے تھے۔ مولانا کے یہاں نہ طبقے کا احساس تھا اور نہ مذہب کا ــــ ان کے سامنے تو بچے صرف بچے تھے اور پیار و محبت ان کا حق تھا۔

مولانا کے یہاں کوئی اور نہ تھا۔ لے دے کے ایک ملازم تھا جو گھر کے فرد کی طرح ان کا خیال رکھتا تھا۔ جب میں جامعہ کے اس گھر میں آیا تو مجھے وہاں ہمہ وقت بچوں کا مجمع نظر آتا۔ مائیں آتیں اور بچوں کو گھسیٹ کر لے جاتیں اور ذرا سی دیر کے بعد بچے پھر وہاں نظر آتے۔ بعض عورتیں یہ سمجھتی تھیں کہ مولانا کو پریشانی ہوتی ہوگی لیکن یہاں تو یہ معاملہ تھا کہ اگر کوئی بچہ نظر نہ آتا تو مولانا اس کی خیریت پوچھنے اس کے گھر آتے۔ مولانا عام طور پر لوگوں کے یہاں آتے جاتے نہ تھے لیکن جب وہ کہیں نظر آتے تو ہم یہی سمجھتے کہ شاید یہاں کوئی بچہ بیمار ہے۔ بچوں کو دیکھ کر مولانا کے چہرے پر جو مسرت نظر آتی اس کا اندازہ ہر وہ شخص لگا سکتا ہے جس نے پھولوں کو کھلتے ہوئے دیکھا ہے، جس نے برسات کی پہلی بارش سے لطف اٹھایا ہے۔ جامعہ اور اوکھلا گاؤں کے بچے مولانا کو گھیرے رہتے۔ بڑے سے بڑا آدمی بھی آجائے تو بھی یہ بچے مولانا کو نہ چھوڑتے تھے۔ ان کے آس پاس لگے رہتے۔ مولانا باتیں کرتے ہوتے اور بچے ان کے پاس کھیلتے رہتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ان بچوں کو ڈر لگ رہا ہے کہ اگر وہ ہٹ گئے تو کوئی بھی مولانا کو لے کر چلا جائے گا، اس لئے وہ ہر وقت پہرا دیتے اور اپنے "بابا" کو کبھی اکیلا نہ چھوڑتے۔ جمعہ کے دن تو یہ منظر خاص طور پر دیکھنے کے لائق ہوتا۔ نماز کے بعد مولانا کو بچے گھیر لیتے۔ مولانا

درمیان میں ہوتے اور بچوں کو گُڑ بانٹتے جاتے ۔ بچے کھاتے جاتے اور اپنے منھ ہاتھ مولانا کے اچکن سے پونچھتے جاتے ۔ مجھے کبھی کبھی بچوں پر غصہ آتا لیکن کس کی مجال تھی کہ مولانا کے سامنے بچوں کو جھڑک بھی سکتا ۔ ایک روز میں نے مولانا سے کہا ––– "یہ بچے آپ کے کپڑے خراب کر دیتے ہیں، آپ انھیں روکتے کیوں نہیں ؟" مولانا نے مسکرا کر کہا "ارے بھائی یہ کپڑے ناپاک کب ہوتے ؟ کہیں بچے بھی آلودہ ہوتے ہیں ۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی برکت ہے۔" اور میں اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا ۔

مولانا حساب کتاب کے معاملے میں بڑے کھرے تھے ۔ ان کے مکان کے دوسرے حصے میں میرے عزیز دوست اور کرم فرما غلام ربانی تاباںؔ صاحب رہتے تھے جو مولانا کے کرایہ دار تھے ۔ کرایا غالباً بیس روپے تھا ۔ مولانا ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو بڑی پابندی سے کرایہ وصول کرنے دفتر جاتے ۔ تاباںؔ صاحب کہتے مولانا میں خود پہنچا دیتا ، آپ کیوں زحمت کرتے ہیں ۔ لیکن مولانا نے اپنے معمول میں کبھی فرق نہیں آنے دیا ۔ ہم لوگوں کا خیال تھا اور شاید کبھی اس کی تصدیق بھی ہوئی کہ مولانا، تاباںؔ صاحب کو مقروض نہیں رکھنا چاہتے تھے ۔

فسادات میں مکتبہ جامعہ ، جو اس وقت قرول باغ میں تھا ، بالکل تباہ ہوگیا تھا ، ہزاروں کی کتابیں ضائع ہوگئی تھیں ۔ پھر دوبارہ ذاکر صاحب کی کوششوں سے مکتبہ کو نئی زندگی ملی اور وہ ایک لمیٹڈ کمپنی کے طور پر منظر عام پر آیا ۔ کچھ عرصے کے بعد جامعہ کے ارباب حل و عقد نے فیصلہ کیا کہ جن مصنفین کی رائلٹی یا حق تصنیف مکتبے کے ذمے باقی ہے یا کسی اور شخص یا ادارے کا کوئی مطالبہ ہے تو اسے ادا کر دینا چاہئے ، چنانچہ مکتبے کی طرف سے باقاعدہ اعلان کیا گیا اور مطالبے کے لیے آخری تاریخ مقرر کر دی گئی تاکہ اس وقت تک لوگ اپنے اپنے "کلیم" داخل کر دیں ––– اخبارات میں بھی اعلان ہوگیا میرے سپرد یہ ذمہ داری کی گئی کہ میں اس فارم کو مولانا کو پہنچا دوں ۔ میں نے وہ فارم مولانا

کو دے دیا۔ مولانا نے اسے میز پر رکھا اور نماز پڑھنے چلے گئے۔ جب آخری تاریخ آ گئی تو معلوم ہوا کہ سب فارم آ گئے، لیکن مولانا کا فارم نہیں پہنچا۔ مجھ سے باز پرس ہوئی۔ میں دوسرا فارم لے کر مولانا کے پاس پہنچا اور میں نے ان سے کہا کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ وہ فارم کہیں رکھ کر بھول گئے۔ میں احتیاطاً دوسرا فارم لے آیا ہوں۔ آپ خانہ پری کر دیں، میں پہنچا دوں گا۔ ذاکر صاحب اور دوسرے لوگ انتظار کر رہے ہیں۔

مولانا نے کہا ــــ "میں بھولا نہیں ــــ وہ فارم رکھا ہوا ہے۔ البتہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ مکتبہ جس طرح برباد ہوا، یہ ایک قومی سانحہ تھا اور میں اس کا تاوان نہیں لینا چاہتا۔" اور یہ کہہ کر وہ دوسری بات کرنے لگے۔ میں نے اپنی رائے دینا چاہی لیکن مولانا ٹال گئے اور بولے "آپ یہی بات ذاکر صاحب اور حامد صاحب سے کہہ دیجئے۔"

میں نے جب دفتر میں اس کی اطلاع دی تو سب کو حیرت ہوئی لیکن ہر ایک نے یہی کہا کہ یہ بات مولانا ہی کر سکتے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ اب سے تیس سال پہلے پانچ ہزار روپے کے کیا معنی ہوتے ہیں۔

جب شہزادہ فیصل دہلی آئے تو انھیں "تاریخ نجد" کے مصنف سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ مولانا ان کے پاس جانے کے موڈ میں نہ تھے، چنانچہ جامعہ میں ہی جلسہ ہوا۔ شہزادہ فیصل خود جامعہ آئے۔ ان کے اعزاز میں جلسہ ہوا اور مولانا نے انھیں "تاریخ نجد" کی ایک جلد تحفتہً پیش کی۔

جوشؔ صاحب جامعہ والوں سے کچھ خوش نہ تھے۔ انھیں ہر ایک سے کوئی نہ کوئی شکایت تھی لیکن مولانا کا نام عزت اور احترام سے لیتے تھے اور ایک بار تو میں نے انھیں مولانا کے سامنے دست بستہ بیٹھے ہوئے دیکھا۔ جوشؔ صاحب جب کبھی دہلی میں ملتے تو مولانا کی خیریت ضرور دریافت کرتے۔

مولانا آزاد اپنے سامنے کس کو خاطر میں لاتے تھے۔ ایک بار میں ان سے ملنے گیا۔ مولانا اسلم کا ذکر آیا۔ مولانا آزاد نے جو الفاظ استعمال کئے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے دل میں مولانا اسلم کی کتنی قدر و منزلت تھی۔ مجھے خیال ہوا کہ یہ بات شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں میں ہوتی ہے کہ ایک دوسرے کے فن کے قدر دان نہیں ہوتے۔ شاید یہ بات عالموں کے مزاج سے بعید ہے۔ مولانا نے جب ان کا ذکر کیا تو میں سوچ رہا تھا کہ اللہ نے مجھے کتنی بڑی سعادت دی ہے کہ میں اتنے بڑے عالم کا پڑوسی ہوں۔

اس زمانے میں میرے ذمے "پیام تعلیم" کی ادارت سپرد تھی۔ جب "پیام تعلیم" چھپ کر آتا اور میں مولانا کو پیش کرتا تو وہ اسے دیکھ کر بڑے خوش ہوتے، اور مجھے ایسا لگتا کہ جیسے کسی بڑے جلسے میں ہاروں سے لاد دیا گیا ہوں۔ اس وقت مجھے کبھی کبھی تو مولانا بالکل بچے معلوم ہوتے جو ذرا سی بات سے خوش ہو جاتے اور کبھی اتنے بزرگ کہ پیٹھ پر جب ہاتھ رکھتے تو اپنے دل میں اپنی ہی قدر و منزلت کا احساس ہوتا۔ ہم جس عہد میں جی رہے ہیں اس میں نوجوان بزرگوں کی شفقت سے محروم ہو گئے ہیں۔ لیکن مولانا نے یہ شفقت فراوانی سے تقسیم کی ــــ اتنی ہی فیاضی سے جیسے وہ بچوں میں گڑ تقسیم کرتے تھے۔

مولانا اتنے بڑے عالم تھے ــــ دنیا کے کونے کونے سے مولانا کے پاس کتابیں آتی تھیں ــــ لیکن مولانا کا کمرہ کتابوں سے خالی رہتا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مولانا پڑھنے کے بعد یہ کتابیں لائبریری بھجوا دیا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے پوچھ لیا کہ "مولانا آپ اتنے بڑے عالم اور مصنف ہیں لیکن آپ کی الماری میں کوئی کتاب نظر نہیں آتی ــ" مولانا مسکرائے اور بولے ــ "ارے میاں! رکھنے کے لائق تو ایک کتاب ہے اور وہ میرے سینے میں محفوظ ہے، اور اس کتاب نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔

گناہ کی لذت سے کون انکار کرسکتا ہے لیکن میں اس کتاب کا وزن اٹھاتے پھر رہا ہوں اور ناکردہ گناہوں کی حسرت لئے بیٹھا ہوں کہ مبادا اس کتاب کو مجھ سے شکایت ہو۔"

میں مولانا کے اس بیان کی بلاغت کے بارے میں اکثر غور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ میں برسوں ایک فرشتے کے پڑوس میں رہا۔ اب اگر کوئی پوچھے کہ فرشتے کی شکل کیسی ہوتی ہوگی تو میں اسے کیا بتاؤں۔ میرے ذہن میں تو مولانا اسلم کی شکل گھومنے لگتی ہے۔

اگر معصومیت، شرافت، نیک نفسی، تہذیب، عبادت، مروت جیسی خوبیاں انسانی شکل اختیار کرنا چاہیں تو مجھے یقین ہے کہ انھیں مولانا اسلم جیراجپوری کے پیکرِ جسمانی کی تلاش ہوگی کیونکہ یہی تو وہ تمام خوبیاں تھیں، جو ان کی شخصیت میں مجتمع تھیں۔

جب مولانا کا انتقال ہوا تو ساری جامعہ سوگ میں ڈوب گئی۔ گھر کے سامنے سڑک سے ذرا ہٹ کر جب جنازہ باہر لاکر رکھا گیا تو جامعہ اور اوکھلے گاؤں کے بچوں نے گھیر لیا۔ ان میں تین تین چار چار سال کے بچے بھی تھے جو زندگی اور موت کے امتیازات سے ناواقف تھے۔ وہ مولانا سے بات کرنا چاہتے تھے ـــــ وہ باتیں کر رہے تھے اور انھیں حیرت تھی کہ آج "بابا" ان کے سوال کا جواب کیوں نہیں دے رہے ہیں، وہ انھیں گڑ کیوں نہیں تقسیم کر رہے ہیں، اور وہ چپ چاپ کیوں پڑے ہیں۔ بابا تو ہم سے کبھی ناراض نہیں ہوئے تھے۔ وہ بچے جو کچھ کچھ سمجھ رہے تھے وہ رو رہے تھے۔ ایک ایک سے پوچھتے تھے کہ بابا کیوں نہیں بولتے؟ ان کو کیا ہوا ہے؟ بابا پہلے تو کبھی ہم سے ناراض نہیں ہوتے تھے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ بابا کو کبھی نہیں ستائیں گے ہم اُن سے گڑ بھی نہیں مانگیں گے،

ان کی اچکن کو کبھی میلا نہیں ہونے دیں گے ـــــ لیکن ذرا سی دیر بعد یا جامعہ والوں کے کندھوں پر چلے گئے ـــــ ایک ایسی منزل کے لئے، جہاں سے کوئی کبھی واپس نہیں آتا ـــــ ننھے منے بچوں کا پہرا دینا کسی کام نہ آیا ـــــ یا با چلے گئے ـــــ چپ چاپ چلے گئے ـــــ کاش وہ پھر آسکتے اور جن لوگوں نے مولانا کو نہیں دیکھا میں ان کو دکھا کر کہہ سکتا ـــــ یہ ہیں مولانا اسلم جیراجپوری ـــــ کیا کوئی انسان ایسا بھی ہو سکتا ہے !!

جذبۂ اخلاص

(مولانا محمد علی مرحوم پہلی نظر بندی اور قید سے رہائی کے بعد ۲۴ جنوری ۱۹۲۰ء کو مدرستہ العلوم علی گڑھ میں تشریف لائے تو خیر مقدمی جلسے میں مولانا اسلم مرحوم نے ذیل کی نظم پڑھ کر سنائی۔)

دہر میں مسلم ہے حق کی آزمائش کے لیے — تمغۂ ایماں نہیں ملتا نمائش کے لیے

کھول اس عبرت کدہ میں دیدۂ تحقیق کو — دیکھ زندانِ بلا میں یوسفِ صدیق کو

گریۂ صبر آزمائے حضرتِ یعقوبؑ دیکھ — روح فرسا ابتلائے یونسؑ و ایوبؑ دیکھ

سرورِ دیں سیدِ کونین محبوبِ خدا — دشمنوں کے جورِ پیہم سے ہوئے گھر سے جدا

سرزمینِ کربلا کی سمت بھی کر لے نگاہ — خاک و خوں میں دیکھ لے نعشِ حسینِ دیں پناہ

آزمائش ہے نشانِ بندگانِ محترم — جانچ ہوتی ہے اسی کی جس پہ ہوتا ہے کرم

اس کسوٹی پر کھرے کھوٹے کی ہوتی ہے تمیز

جھیل کر زنداں کی سختی ہوتے ہیں یوسف عزیز

محمد معظم جیراجپوری

یادوں کے چراغ

میرے والد مولانا محمد اسلم جیراجپوری کی یاد میرے لئے سرمایۂ حیات اور ان کے شاگردوں، دوستوں، ملنے والوں اور معتقدوں کے لئے چراغِ راہ ہے۔ ان کے ساتھیوں میں سے آج بہت ہی کم لوگ بقیدِ حیات ہوں گے مگر ان کے شاگردوں علم کے خوشہ چینوں اور معتقدوں کی اچھی خاصی تعداد ہندو پاکستان میں اب بھی موجود ہوگی۔ ان کے دلوں میں مولانا مرحوم کی یادوں کے چراغ آج بھی جھلملاتے ہوں گے۔

۱۹۸۲ء میں ان کی پیدائش پر سو سال بیت گئے۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۵۵ء کو انھوں نے اس دنیا کو خیرباد کہا، اس طرح اس کو بھی ۲۶ برس ہو گئے، کم و بیش ۷۴ سال انھوں نے اس دنیائے آب و گل میں گزارے۔ زندگی کے یہ ۷۴ سال زمانہ کے نشیب و فراز اور حالات کی کٹھنائیوں اور ناہمواریوں کی ایک طویل داستان ہے۔

طالب علمی کا زمانہ جو کہ انھوں نے اپنے والد یعنی میرے دادا حضرت مولانا سلامت اللہؒ کے سایۂ عاطفت میں گذارا، وہ تو ضرور خوشگوار اور شاندار تھا، کیونکہ وہ نواب صدیق حسن خاں اور ملکہ عُلیا بھوپال شاہ جہاں بیگم کا زمانہ تھا۔ دادا مہتمم تعلیمات تھے۔ یہ ریاست بھوپال کی خوشحالی اور فارغ البالی کا سنہری زمانہ سمجھا جاتا تھا۔ ساری دنیا سے چن چن کر علماء و مشائخ علم دین کی خدمت کے لئے بھوپال لائے گئے اور ملک کے کونے کونے سے علم کے پیاسے بھوپال میں سیراب

ہونے کے لئے آتے رہے۔ دادا مرحوم کو رہنے کے لئے ریاست کا ایک محل جس کو قدسیہ محل، کہا جاتا تھا، ملا ہوا تھا۔ ہر طرح کا آرام و آسائش کا سامان میسر تھا۔ والد مرحوم کی تعلیم کی تکمیل کے تھوڑے ہی عرصہ بعد دادا مرحوم کا انتقال ہو گیا، لیکن دادا مرحوم کے انتقال سے تقریباً ایک سال پہلے والد مرحوم کو بھوپال کی سکونت ترک کر کے تلاش معاش میں مشکلات زمانہ سے نبرد آزما ہونے کے لئے نکلنا پڑا

۱۹۰۳ء میں پیسہ اخبار (لاہور) میں ملازمت کی۔ اس کے تین سال بعد ۱۹۰۶ء میں علی گڑھ کالیجئیٹ اسکول میں عربی اور فارسی کے استاد کی حیثیت سے آئے۔ چھ سال کے بعد کالج کی لٹن لائبریری میں مشرقی کتابوں کا شعبہ ان کے سپرد کیا گیا اور انھوں نے اس کی فہرست بڑی خوش اسلوبی سے مرتب کی۔ کچھ عرصہ کے بعد علی گڑھ ایم۔ اے۔ او کالج میں وہ عربی اور فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔

۱۹۲۰ء کا ہنگامہ خیز سال شروع ہوا۔ انگریز کی غلامی کے خلاف ایک نیا جوش ایک نیا ولولہ جاگ اٹھا اور ملک میں آزادی کی تڑپ نے نئی نئی تحریکوں کو جنم دیا۔ مسلمان علماء بھی گاندھی جی کی ترک موالات کی تحریک میں شریک ہو گئے اور سر ہتھیلیوں پر رکھ کر میدان عمل میں اتر آئے۔ جیلیں بھری جانے لگیں، اور جیلوں کو اپنی تنگ دامانی کا شکوہ ہونے لگا۔

اسی آزادی کی تڑپ نے علی گڑھ کالج کے کچھ اساتذہ اور طلباء کو علی گڑھ کالج کو چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ ان لوگوں نے اپنے بزرگوں کی آواز پر لبیک کہا اور وہیں علی گڑھ میں چھپروں، کچے مکانوں اور خیموں میں آزاد تعلیم گاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے ایک قومی یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی۔

مولانا مرحوم نے بھی بزرگانِ ملت کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے کالج کی ملازمت چھوڑ دی۔ آرام و آسائش کی زندگی کا لبادہ اتار کر پھینک دیا اور جامعہ ملیہ میں خدمتِ قوم کا جذبہ لے کر پہونچ گئے اور بوریہ نشینوں کے اسی قافلہ میں شامل ہو گئے۔

جیسا کہ سب کو معلوم ہے ۱۹۲۵ء میں علی گڈھ سے جامعہ ملیہ کو حکیم اجمل خاں کے اصرار پر دہلی لایا گیا اور قرول باغ میں کچھ کوٹھیاں کرایہ پر لے کر درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔ قرول باغ میں جامعہ ملیہ ابتدائی درجات سے لے کر کالج تک ۱۹۳۶ء تک رہی اور آہستہ آہستہ ۱۹۳۶ء تک مدرسہ تعلیمی مرکز ۱ اور مکتبہ جامعہ کے علاوہ سارے شعبہ جات اور تعلیمی درجات اوکھلا منتقل ہو گئے۔ جہاں آج بھی وہ ایک کامیاب یونیورسٹی کی حیثیت سے ملک اور قوم کی خدمت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے رہی ہے۔

یہ سب کچھ تو میں نے تمہید کے طور پر لکھا ہے، دراصل مجھے تو آپ کو مولانا مرحوم کی باتیں جو میرے ذہن و دماغ میں ایک چراغ کی طرح روشن ہیں، سنانا ہے۔ ان کی علمی حیثیت کا میرے جیسا کم علم و کم حیثیت، تہی دست و تہی مایہ آدمی کیا اندازہ کر سکے گا۔ یہ کام تو اہلِ علم حضرات کا ہے۔ میں تو صرف مولانا مرحوم کی زندگی کے کچھ ایسے واقعات جو مجھے یاد ہیں، بتانے پر اکتفا کروں گا۔

۱۹۲۰ء میں جب انھوں نے علی گڈھ کالج کی ملازمت ترک کی تو اسی زمانہ میں ان کو ایک ایسے المناک اور دردناک حادثہ سے دوچار ہونا پڑا جو قوی سے قوی ذہین شخص کو بھی جھنجھوڑ کر اس کے پر اچھے اڑا دینے کے لئے کافی ہے، یعنی میرا ابھی عمر صرف چھ ماہ کا ہی تھا کہ میری والدہ چار عدد چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر اس جہان فانی سے سدھار گئیں اور میرے والد ہم سب کا بوجھ اٹھانے کے لئے تنہا رہ گئے۔ لیکن میری

دادی مرحومہ زندہ تھیں، انھوں نے ہم سب بھائی بہنوں کی پرورش کا بار اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھالیا۔ والد صاحب کسی طرح دوسری شادی کے لئے تیار نہیں تھے، مگر چار سال کے بعد جب بچے کچھ بڑے ہوگئے اور بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں کا اصرار زیادہ بڑھ گیا تو انھوں نے ایک دوسری شادی کی اور ان کو اپنے ساتھ قرولباغ، دہلی لے آئے مگر بدبختی نے ساتھ نہیں چھوڑا اور وہ اسی سال بعارضہ چیچک اللہ کو پیاری ہوگئیں اور ان کو پھر ایک دردناک صورت حال میں چھوڑ گئیں۔ بچوں کی پرورش اب بوڑھی ماں کے لئے ایک مشکل مسئلہ بن گیا تھا، اس لئے اعزہ اور اقربا نیز دادی مرحومہ کے بے حد اصرار پر پھر انھوں نے شادی کی۔ آزمائش کی منزل ابھی شاید ختم نہیں ہوئی تھی اور مالک کون ومکاں کو انھیں اور بھی سخت امتحان سے گذارنا مقصود تھا، یہ اہلیہ دماغی عارضہ میں مبتلا ہوکر مستقلاً ان کو حوادثات زمانہ کے سپرد کرکے وطن جاکر رہنے پر مجبور ہوگئیں۔ اگرچہ ان کا انتقال مولانا مرحوم کے بعد ہوا مگر وہ ذہنی اور دماغی طور پر کبھی بھی اس قابل نہ ہوسکیں کہ ان کے ساتھ رہ کر زندگی کی سختیوں میں ہاتھ بٹا سکتیں۔

مولانا مرحوم کی والدہ یعنی میری دادی ایک مخیر، پاکباز، نیک طینت، پابند صوم وصلوٰۃ اور معزز ومحترم خاتون تھیں، پورے جیراجپور کی ماں اور بہن تھیں، اس لئے کہ ان کا میکہ بھی گاؤں ہی میں تھا، کتنی ہی لڑکیوں کی انھوں نے سرپرستی کی، کتنوں کی شادیاں کیں، کسی بھی لڑکی کی رخصتی بغیر ان کی دعائے خیر کے بدشگونی سمجھی جاتی تھی اور کوئی بھی مسئلہ ان کے مشوروں کے بغیر حل نہیں ہوپاتا تھا۔

سنہ ۴۰ء میں والد صاحب مجھ کو اپنے ساتھ دہلی لائے۔ سنہ ۴۶ء تک میں ان کے سایۂ عاطفت میں رہا۔ میں اور والد صاحب اور ایک ملازم بس یہ تین انسانوں کا ایک مختصر سا قافلہ تھا جو زمانہ کی سختیوں کا مقابلہ کرنے کا تہیہ کئے ہوئے تھا۔

مولانا مرحوم نہایت صابر وشاکر، پابند صوم وصلوٰۃ، تہجد گذار اور معاملات کے بہت صاف اور کھرے تھے۔ نماز بالعموم جماعت سے پڑھتے تھے اور مسجد کا جو بھی امام ہوتا اسی کے پیچھے پڑھتے۔ غریبوں، یتیموں، بیواؤں اور مجبوروں کا دل میں بہت درد

رکھتے تھے ۔ تنگیٔ حالات کے باوجود ایسے لوگوں کی ہر ممکن مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے ۔ ایک دفعہ جامعہ نگر (اوکھلا) میں ایک عجیب سے واقعہ نے ان کو بہت متاثر کیا ۔ مغرب کی نماز پڑھنے وہ اوکھلا کی مسجد میں تشریف لے گئے وہاں انھوں نے ایک باریش بزرگ اور ان کے باریش نوجوان بیٹے کو دیکھا ۔ وہ دونوں باقاعدہ نماز باجماعت میں شریک ہوئے ۔ اوکھلا اس وقت چند جھونپڑیوں اور کچے معمولی مکانوں کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور چونکہ مسلمان زیادہ تعداد میں تھے اور گاؤں کا نمبردار بھی مسلمان تھا اس لئے یہ مسجد بھی نماز کے لئے موجود تھی ۔ اور دوسری کسی قسم کی کوئی آسائش میسر نہیں تھی ، نہ کوئی ہوٹل نہ چائے خانہ اور نہ ہی کوئی ڈھنگ کی دوکان ۔ چنانچہ نماز کے بعد والد صاحب نے اُن دونوں باپ بیٹوں سے دریافت کیا کہ وہ لوگ کہاں سے آئے ہیں ۔ معلوم ہوا کہ پردیسی ہیں اور کام کی تلاش میں نکلے ہیں ، چنانچہ حسب عادت انھوں نے اُن لوگوں سے اپنے گھر چلنے کے لئے کہا اور درخواست کی کہ جب تک کوئی روزگار ان کو نہ ملے ، وہ لوگ کھانا ان کے یہاں ہی کھائیں ۔ مگر ان دونوں باپ بیٹوں نے شکریہ کے ساتھ معذرت کی اور نہ صرف مولانا کی بلکہ گاؤں کے کسی بھی شخص کے یہاں کی دعوت قبول نہیں کی اور کہا کہ جب کوئی مزدوری وغیرہ مل جائے گی تو اسی سے روٹی کھائیں گے ۔ دوسرے روز والد صاحب نے جامعہ کے ٹھیکیدار تعمیرات اللہ دیا سے کہہ کر ان لوگوں کو مزدوری پر لگوا دیا اور مزدوری کے پیسے ملنے پر ان دونوں نے مسجد کے پیچھے چولہا لگا کر اپنا کھانا پکایا ۔ اس طرح نہ جانے کتنے روز کے فاقہ کے بعد اپنی حلال کی کمائی سے روٹی کھائی ۔ اس واقعہ کا وہ اکثر ذکر فرمایا کرتے اور کہا کرتے تھے کہ بیشک یہ لوگ اللہ پاک کی نظروں میں زیادہ عزیز ہیں ۔

مولانا مرحوم کی زندگی بے حد سادہ تھی ۔ مکان کا کُل اثاثہ تین چار چارپائیاں ، کچھ چٹائیاں اور چند ایک ضروری برتنوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا ۔

جامعہ چونکہ قوم کے چندوں سے چلتی تھی اس لئے کارکنان جامعہ بے حد تنگی ترشی سے گذر بسر کرتے تھے ۔ طلباء ، اساتذہ سب کا یہی حال تھا ۔ کبھی تنخواہ ملی کبھی نہیں ملی ۔ کبھی کھانے کو مل گیا اور کبھی اللہ بہ توکل وقت کٹ گیا ۔ مگر اللہ بھلا کرے ماسٹر عبدالحئی صاحب

مرحوم کا جو کہ جامعہ کے ناظم مطبخ تھے کہ وہ اکثر لوگوں کو فاقہ سے بچا لیتے تھے۔ جنگ کے ساتھ اشیاء ناپید ہونا شروع ہوئیں، بدترین قسم کی گرانی آگئی

۱۹۴۳ء میں ہم لوگ بھی جامعہ کے اور لوگوں کے ساتھ اوکھلا منتقل ہو گئے تھے، ایسٹ اور ویسٹ دونوں بلاک بن چکے تھے تعلیمی سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ مگر اساتذہ اور کارکنان کے رہنے بلکہ سر چھپانے کے لئے کوئی چھپر بھی میسر نہیں تھا۔ بہت سے لوگ شام کو اوکھلا ریلوے اسٹیشن سے ٹرین کے ذریعہ واپس قرولباغ جاتے اور دوسری صبح پھر آجاتے مگر یہ سلسلہ بہت ہی تکلیف دہ تھا چنانچہ ذاکر صاحب سے لوگوں نے درخواست کی اور معاملہ مجلس منتظمہ میں پیش ہوا کہ فاقہ تو کبھی کبھی کیا جا سکتا ہے مگر بغیر چھت کے رہائش کس طرح ممکن ہے جب کہ اوکھلا میں کوئی چھپر بھی سر چھپانے کے لئے میسر نہیں۔ طے ہوا کہ کالج کی عمارت کے لئے جو روپے چندہ میں آئے ہیں وہ تھوڑا تھوڑا ضرورت مند اساتذہ کو دے دیا جائے اور ان کی بقایا تنخواہ میں سے وضع کر لیا جائے اس طرح لوگ اپنے لئے سر چھپانے کی چھت بنا لیں گے چنانچہ مولانا مرحوم کو بھی کچھ روپیہ الاٹ ہوا اور انھوں نے جامعہ کی ہی معرفت ماسٹر نور محمد صاحب کے مکان کی بغل میں ایک زمین کا ٹکڑا خریدا اور اپنے ایک ریٹائرڈ اوورسیر دوست بابو شجاعت علی کو بلا کر کہا کہ:

"بابو جی میں نے زمین کا ایک قطعہ نور محمد صاحب، استاد استادوں کا مدرسہ کے مکان کی بغل میں خریدا ہے جو کہ اوکھلا نہر کی طرف جانے والے راستہ پر ہے مگر میں نے اس کو خود نہیں دیکھا ہے آپ دیکھ لیجئے گا۔ اور جامعہ نے کچھ روپے تعمیر مکان کے لئے الاٹ کئے ہیں۔ میں دو ماہ کے لئے چھٹیوں میں وطن جا رہا ہوں وہ روپے لے کر آپ اس قطعہ زمین پر ایک مکان میرے لئے بنوا دیں۔ کیا ہو، کیسا ہو، مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں۔ بس ایک مکان ہو جس پر چھت ہو اور میرا ایک کمرہ ہو جس میں جب میں آؤں تو میری چارپائی اور حقہ رکھا ہوا ہو۔"

مولانا یہ کہہ کر وطن روانہ ہو گئے۔ جب واپس آئے تو حسب الحکم بابو شجاعت علی

صاحب نے اللہ دیا ٹھیکیدار کے ذریعہ ایک عمدہ مکان کھڑا کروا دیا۔ وطن سے واپسی میں جامعہ اسٹور کے پاس مرحوم اختر صاحب جو کہ جامعہ کے ہر دلعزیز نوجوان استاد تھے راستہ میں ملے۔ اُن سے پوچھا کہ کیا میرا مکان کچھ بن گیا ہے اور وہ ہے کہاں ؟ اختر صاحب مرحوم نے جواب دیا :

" جی ہاں مولانا آپ کا مکان بن رہا ہے اور آپ کا کمرہ تو پلاسٹر کرکے بالکل تیار ہے۔ آپ کی چارپائی بچھی ہوئی ہے اور آپ کا حقہ بھرا رکھا ہے جس کو اللہ دیا نوش جاں فرما رہے ہیں میں ابھی دیکھ کر آ رہا ہوں۔" گھوم کر نہر کی طرف سے تانگہ لے جانا ہوگا۔ انھوں نے راستہ بتادیا اور اس طرح اُس زمین اور اُس پر بنے ہوئے مکان کا پتہ چلاتے ہوئے ہم لوگ یعنی میں، والد صاحب اور رحمت اللہ ملازم تینوں آدمی اس قصر الحمرا کے پاس پہونچ گئے جس کو گھر کہہ لیجئے، محل کہہ لیجئے، جھونپڑا کہہ لیجئے۔ آج مولانا موجود نہیں مگر اُن کے پوتے پوتیاں اسی مکان میں ان کے روحانی سایۂ عاطفت میں زندگی گزار رہے ہیں۔

مولانا مرحوم نہایت سادہ کھانا کھاتے (اور وہی نصیب بھی تھا) اور اپنے ساتھ اپنے نوکر کو بھی بٹھا کر کھلاتے تھے، اگر نوکر حقہ کا شوقین ہوتا تو وہ اس میں شریک ہوتا، بلکہ نثر دعات وہی کرتا۔ مولانا کو حقہ کا بہت شوق تھا۔ بہت تکلف کے ساتھ حقہ سجایا جاتا اور بہت اطمینان کے ساتھ اس سے شغل فرماتے۔ تمباکو وطن سے منگوا کر لاتے اور بڑے تکلف کے ساتھ استعمال کرتے۔

قرولباغ کے زمانۂ قیام میں ملنے جلنے والوں کا حلقہ بہت وسیع تھا مگر اوکھلا آجانے کے بعد لوگ سفر کی دقت کی وجہ سے بمشکل پہونچ پاتے تھے مگر پھر بھی آتے رہتے تھے۔ اہل علم اور جامعہ کے اساتذہ مثلاً مولانا شرف الدین یاس ٹونکی صاحب استاد اردو، مولانا محمد سورتی صاحب مرحوم، ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب مرحوم، خواجہ حافظ فیاض صاحب مرحوم حامد علی خاں صاحب مرحوم اکثر ملنے آتے رہتے تھے۔ مولانا سورتی صاحب مرحوم کے کئی لڑکے میرے ساتھی تھے، بچوں اور بچیوں کی پوری ٹیم تھی اور وہ خود میاں بیوی رلیفری۔ نہایت لحیم شحیم بھاری بھرکم شخصیت کے مالک تھے۔ میں اُن سے بہت ڈرتا تھا اور ان کو

دیکھ کر چھپ جایا کرتا تھا۔ مولانا سورتی مرحوم کٹڑا اہلحدیث تھے اور مولانا اسلم صاحب سے گھنٹوں بلکہ کئی کئی دن بحث کرتے رہتے تھے، دونوں صاحبان میں تعلقات بے حد خوشگوار تھے۔
مولانا شرف الدین مرحوم کی شخصیت بھی نرالی تھی۔ اردو کے استاد تھے اور نہایت سخت گیر واقع ہوئے تھے۔ تلفظ کی ذراسی بھی غلطی ان کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ غلط اردو بولنے والے کو کبھی معاف نہیں کر سکتے تھے۔ گھر سے جامعہ تک آتے ہوئے راستہ میں گوردوارہ روڈ پر کسی تاجر کی کوٹھی پڑتی تھی اس پر ایک بڑی سی گھڑی لگی ہوئی تھی۔..............
.... اور نیچے مکان والے کا نام "محمد یعقوب دہلے" لکھا ہوا تھا۔ ٹونکی صاحب جب وہاں سے گذرتے کتاب سے اپنا منہ ڈھانک لیتے۔ جب اس کی وجہ طالب علموں نے ڈرتے ڈرتے دریافت کی تو نہایت غصہ میں فرمایا کہ دیکھا نہیں دلی کو دہلے لکھا ہے کمبخت نے۔ کیسا زمانہ تھا اور کیسے کیسے معصوم صفت لوگ تھے۔
قرولباغ میں جامعہ بہت تھوڑے سے اساتذہ اور طلبہ کا نام تھا یعنی کل ڈھائی تین سو۔ جامعہ میں داخلہ کے لئے اپنے بچوں کو بھیجنا بہت ہمت کا کام تھا، وہاں پڑھنے والے کا نہ تو کوئی مستقبل تھا اور نہ ہی کوئی آرام دہ زندگی، سادہ کھانا، سادہ کھدر کا لباس، ٹاٹ پر بیٹھنا اور کھاٹ پر سونا۔ مولانا مرحوم کا بھی یہی لباس فاخرہ تھا۔ کھدر کا کرتا پاجامہ اور موٹے کھدر کی شیروانی اور ترکی ٹوپی۔ دور سے ان کی شخصیت پہچان لی جاتی تھی لیکن ان کی اس سادہ پوشاک کا دلوں پر بہت دیر تک اثر باقی رہتا تھا۔
۳۲ء یا ۳۳ء میں جناب چودھری غلام احمد پرویز ایڈیٹر طلوع اسلام بھی کچھ عرصہ کے لئے ہم لوگوں کے ساتھ قرولباغ میں شامل ہوگئے۔ وہ مولانا سے عربی زبان اور قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرنے کے خیال سے آئے تھے۔ گھر کا باورچی خانہ ان کے چارج میں دے دیا گیا کیونکہ وہ سالن بہت اچھا پکاتے تھے۔ نوکر صرف روٹی پکاتا تھا، جو کبھی بازار سے بھی آجاتی تھی۔ اُن کے آنے سے کچھ روز کے لیے ذائقہ دار کھانے کا بندوبست ہوگیا۔
ایک روز ایک ریٹائرڈ فوجی خیرات مانگتا ہوا ہمارے دروازہ پر آیا۔ وہ ضلع میانوالی کا رہنے والا تھا اور پنجابی اور پشتو ملی جلی بولتا تھا جس کو بڑی مشکل سے لوگ سمجھ پاتے تھے

چودھری صاحب نے اُس کو سمجھا بجھا کر بھیک مانگنے سے منع کیا اور کھانا پکانے پر نوکر رکھ لیا۔
اسی زمانے میں ہمارا ایک نوکر جو گاؤں گیا تو پھر واپس ہی نہیں آیا چنانچہ فوجی روٹی ٹھوکتا اور
چودھری صاحب سالن پکاتے۔ فوجی کا صرف موٹی موٹی روٹی ٹھوکنا آتا تھا، بہرحال کام چلتا رہا
مگر وہ حقہ بہت پیتا تھا اس لئے تمباکو کا خرچ بہت بڑھ گیا۔ جب جامعہ میں چھٹیاں ہوئیں تو ہم
لوگوں نے وطن کا ارادہ کیا۔ فوجی بھی واپس جانا چاہتا تھا چنانچہ جاتے جاتے والد صاحب کا
فرشی حقہ، شیروانی، ایک جوڑا کپڑا، دری اور جوتا بخشش مانگ کر لے گیا اور والد صاحب
نے ایک ایک کر کے سب اُس کو بخوشی بخش دیا۔ جبکہ وہ فرشی حقہ اُن کو بہت عزیز تھا۔ پرویز صاحب
دو ماہ کے لئے اپنے ایک دوست کے یہاں چلے گئے، چھٹیوں بعد پھر آملے۔ جامعہ کے اوکھلے میں
منتقل ہو جانے کے بعد بھی وہ دوسرے تیسرے آتے رہے مگر پاکستان بن جانے کے بعد وہ
مستقلاً یہاں سے چلے گئے اور پھر کبھی ہندوستان واپس نہیں آئے۔

نوجوان لوگوں میں مولانا امداد صابری صاحب جو کہ دہلی کے ڈپٹی میئر رہ چکے ہیں اور شاید
آج کل مدینہ منورہ میں ہیں اور بہت سی مذہبی، ادبی اور تاریخی کتابیں بھی انھوں نے تصنیف
کی ہیں، مرحوم سے ملنے بہت آیا کرتے تھے۔ مولانا بھی ان سے کافی شفقت کرتے تھے کیونکہ مولانا
امداد صابری صاحب کے والد مرحوم سے بھی مولانا مرحوم کے بہت تعلقات تھے اور دونوں ایک
دوسرے کی بہت عزت کرتے تھے۔

والد مرحوم کے یہاں آنے والے یوں تو سینکڑوں تھے۔ عالم، ادیب، شاعر، طلباء،
اساتذہ سبھی طرح کے لوگ تھے۔

ان آنے والوں میں ایک جسٹس سر شاہ سلیمان مرحوم فیڈرل کورٹ کے جج بھی تھے۔ جو
قرولباغ کے دوران قیام میں اکثر تشریف لاتے رہے۔ قانون کے ماہر ہونے کے ساتھ مذہبی علوم
میں بھی ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ہمارے یہاں جب بھی تشریف لاتے، اپنی لمبی موٹر کار شاہی
سڑک کے پیچھے آڑ میں کھڑی کرتے، قرولباغ میں شاہی کنواں ٹھیک چوراہے پر واقع تھا۔
اپنے ڈرائیور خاں صاحب سے کہا کرتے تھے کہ میں مولانا کے گھر کے سامنے کار پر بیٹھ کر نہیں
جاؤں گا۔ وہاں سے پیدل چل کر آتے۔ چٹائی پر بیٹھتے۔ ٹوٹی پھوٹی پیالیوں میں چائے پیتے اور گھنٹوں

باتیں کرتے۔ سوٹ پہننے والے آدمی تھے مگر یہاں شیروانی، پاجامہ اور ترکی ٹوپی میں تشریف لاتے۔ ان کا انتقال غالباً ۱۹۴۱ء یا ۱۹۴۲ء میں ہوا، ہم سب لوگ جنازہ میں شریک ہوئے۔ درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین کے قبرستان میں ان کی قبر ہے۔

حضرت خواجہ حسن نظامی مرحوم بھی اکثر قرولباغ میں اور جامعہ نگر اپنی فورڈ گاڑی میں بیٹھ کر تشریف لاتے اور بڑے خلوص سے ملا کرتے اور اس کا تذکرہ مشہور رسالہ منادی کے روزنامچہ میں کیا کرتے۔ بہت ہی مخلص انسان اور بزرگ شخصیت تھی ان کی۔ ان کے سبھی لڑکے جامعہ کے طالب علم ہیں۔ بڑے لڑکے حسین نظامی صاحب میرے کلاس فیلو تھے۔

مولانا آزاد سبحانی مرحوم مشہور ریوکرانیہ عالم، مجاہد، مفکر اور فلسفی بھی اکثر قرولباغ، اور اوکھلا جامعہ نگر میں تشریف لاتے، ان کا زیادہ تر قیام ہمارے یہاں ہی رہتا تھا۔ والد صاحب اور سبحانی صاحب مرحوم سے رات گئے تک بحثیں ہوتی رہتیں۔ میٹھی چیزوں کے بہت شوقین تھے، خاص طور پر ریوڑی (کھونٹیاں) اور دہلی والی گزک کے۔ ان کے لئے یہ دونوں چیزیں مہیا کی جاتی تھیں اور وہ بہت ہی شوق سے شغل فرماتے۔ کہا کرتے تھے کہ مولانا کھونٹیاں کی کڑک تڑک تو منفرد ہے ہی مگر گزک کا بھی والد جواب نہیں، کیا لطافت ہے کیا خستگی ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کے دو الگ الگ مکتب خیال کی طرح گزک اور ریوڑی کا بھی اپنا اپنا اور منفرد مقام ہے۔ ایک دفعہ مجھے یاد ہے کہ گزک کے ساتھ میں چڑے کی پاپڑی لیتا آیا تو اس کو دیکھ کر فرمانے لگے۔ واللہ کیا خوب، یہ گزک کے ساتھ چزک! ایک طرفہ ہی مزہ ہے اس کا۔ لمبی آستین کا کرتہ، تہبند اور اونچی باڑھ کی ٹوپی، پیر میں کبھی لکڑی کی کھڑاؤں اور کبھی چپل، صدری زیب تن کئے، ہاتھ میں چھتری لئے، بڑی مقفا اور مسجع زبان بولتے تھے۔

والد صاحب جمعہ کی نماز پڑھنے اکثر جامع مسجد دہلی میں جاتے تھے۔ راستہ میں مشہور اہلحدیث مدرسہ رحمانیہ پڑتا تھا۔ وہاں کے اساتذہ سے ملتے ہوئے جاتے تھے۔ ندوۃ المصنفین بھی راستہ ہی میں کھجور والی گلی فیض بازار میں پڑتا، وہاں بھی رک کر تھوڑی دیر مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب سے ملتے ہوئے جاتے تھے۔ یہ دونوں حضرات بھی اکثر ہمارے یہاں مولانا مرحوم سے ملنے آیا کرتے تھے۔

مدرسہ رحمانیہ کے شیخ عطاء الرحمن مرحوم ایک تاجر تھے اور باڑہ ہندو راؤ میں ان کا برف کا کارخانہ تھا، نہایت نیک اور بزرگ شخصیت تھی ان کی پڑھے لکھے تو زیادہ نہیں تھے مگر دین کی خدمت کا جذبہ رکھتے تھے اور مدرسہ رحمانیہ کی ہر طرح کفالت فرماتے تھے۔ والد صاحب مرحوم سے ان کو بہت لگاؤ تھا اور ہر جمعہ کو وہ ہمہ تن انتظار رہتے تھے۔

مولانا کے ساتھ میں بھی جاتا تھا اس لئے کہ مجھے اکیلا کس پر چھوڑ جاتے۔ میری دلچسپی کی وہاں ایک عجیب چیز تھی یعنی مدرسہ رحمانیہ کے بالکل سامنے ایک مولوی صاحب کا مکان تھا جن کے چار بیویاں تھیں جن سے ۱۲ عدد بچے بچیاں تھے جن کے پڑھنے کے لئے انھوں نے الگ سے ایک مدرسہ کھول رکھا تھا۔ پورا مدرسہ انھیں کے بچوں سے بھرا رہتا تھا، کچھ بچے شاید محلے والوں کے بھی آجاتے ہوں۔

خاکسار تحریک کے بانی اور تذکرہ کے مصنف مشہور عالم جناب علامہ مشرقی صاحب کو اکثر تشریف لاتے دیکھا۔ خاکی پاجامہ، خاکی قمیص، بالوں والی اینچی باڑھ والی ٹوپی، خوبصورت وجیہہ اور دلکش شخصیت کے مالک۔ مولانا مرحوم کو مشرقی صاحب کی تحریک سے کوئی دلچسپی تھی یا نہیں، یہ تو مجھے نہیں معلوم مگر دونوں حضرات نہایت خوشگوار انداز میں باتیں کیا کرتے تھے۔ علامہ مشرقی صاحب کافی پر وگریسو قسم کے عالم تھے۔

مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم مشہور مجاہد آزادی، عالم اور مفکر جامعہ نگر اوکھلا میں ہمارے گھر کے قریب ہی نور محمد صاحب کے مکان میں قیام پذیر تھے۔ مرحوم قریب قریب روزانہ ہی والد صاحب سے ملنے تشریف لاتے، گھنٹوں باتیں ہوتی رہتیں اور عام طور پر مسلمانوں کی بے حسی، بدحالی، تعلیمی پس ماندگی اور اخلاقی زبوں حالی کا تذکرہ ہوا کرتا۔ مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مولانا اسلم صاحب بہت روشن دماغ اور کھلے ذہن کے عالم ہیں۔

شعراء میں حضرت جگر مراد آبادی کی تشریف آوری بھی یاد ہے۔ وہ رشید علی خاں صاحب مہتمم مکتبہ جامعہ کے بھائی جناب محمود علی خاں صاحب کے دوستوں میں سے تھے اور دہلی میں انھیں کے ہاں قیام پذیر ہوتے تھے۔ وہ ہمارے ہاں تشریف لائے مگر ٹھیک دوپہر جب کہ گرمیوں میں دہلی میں آفتاب سوا نیزے پر آجاتا ہے۔ اپنی کوئی تازہ غزل مرحمت فرماتے، تعریف

کے ایک ایک لفظ پر جھوم جھوم جاتے ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جگر مرحوم کسی وقت بھی عالم سرور سے ہوش کی دنیا میں آنے سے گریز کرتے تھے ۔ مولانا کے ملازم رحمت اللہ ان سے خوب واقف تھے ۔ جب بھی وہ تشریف لاتے، رحمت اللہ کی دلچسپی بڑھ جاتی، ان کی غزلیں رحمت اللہ کے دل میں گدگدی پیدا کرتیں، وہ فوراً مولانا کو جگاتے اور کہتے "او آگئین ہیں مراد آباد والے جگر صاحب ۔ کھوب چڑھی ہے اور جیبا میں ٹھرا کی بوتل بھی رکھے ہیا ۔۔۔ یہوں پی ہیں کا"

مولانا اپنے نام کے آگے جیراجپوری لکھا کرتے تھے جوکہ اپنے وطن اور وطن والوں سے ان کی محبت، پیار اور خلوص کا آئنہ دار ہے ۔ جیراجپور اعظم گڈھ ضلع میں پانچ ہزار آبادی کا ایک گاؤں ہے ۔ حضرت علامہ شبلی نعمانیؒ کے گاؤں بندول سے بالکل ہی ملا ہوا ہے ۔ اعظم گڈھ کا ضلع قدیم وجدید تعلیم میں بہت آگے ہے اور ہندوستان ہی نہیں بیرون ہند اپنا ایک اونچا مقام رکھتا ہے ۔ بہت ہی غریب ضلع ہے مگر تعلیم میں اس کا درجہ بہت بلند ہے ۔ جیراجپور بھی جوکہ ملی جلی آبادی کا ایک گاؤں ہے، تعلیمی لحاظ سے بہت آگے رہا ہے ۔ بندول اور جیراجپور میں پڑھے لکھے لڑکے لڑکیوں کی تعداد ہزاروں ہے ۔ علماء کی اچھی خاصی تعداد یہاں پیدا ہوئی جنھوں نے ملک کے کونے کونے میں خدمت دین کا نمایاں کام انجام دیا ۔

جیراجپور بہت سے جیّد عالموں کا گہوارہ رہ چکا ہے ۔ میرے دادا مولانا سلامت اللہ رحؒ مہتمم تعلیمات بھوپال کے علاوہ ان کے اور علامہ شبلی نعمانیؒ کے استاد مولانا حکیم عبد اللہ جیراجپوری، ان کے صاحبزادے مولانا حکیم عبدالسلام جیراجپوری، مولانا عبدالغفور مشہور اہلحدیث عالم، مولانا عبدالودود استاد ندوۃ العلماء، مولانا شبلی جیراجپوری استاد ندوۃ العلماء، مولانا مصلح الدین مرحوم استاد جامعۃ العلوم بنارس وغیرہ وغیرہ ۔

انگریزی تعلیم کا بھی یہاں بہت چرچا ہے ۔ جیساکہ میں لکھ چکا ہوں سینکڑوں لڑکے لڑکیاں اعلیٰ تعلیم یافتہ اس گاؤں کے ملک اور دنیا کے دوسرے ممالک میں علم کی روشنی پھیلا رہے ہیں ۔ مولانا اسلم مرحوم اور ان تمام بزرگوں عالموں نے یہ علم کی روشنی پھیلائی ہے ۔ مولانا کو گاؤں کے لوگوں خاص طور پر بچوں سے بہت پیار تھا ۔ گاؤں کے لوگ بھی

اُن پر جان چھڑکتے تھے اور ان کی بے حد عزت و احترام کرتے تھے۔

گرمی کی تعطیلات میں ان کا وطن پہونچنا ضروری تھا۔ جہاں لوگ ان کو دیکھنے، ان کو سننے، ان سے سیکھنے کے لئے بے چین رہتے تھے۔ ایک جمگھٹا سا ان کے چاروں طرف لگا رہتا تھا۔ گاؤں کا جاہل آدمی بھی ان بزرگوں کی صحبت کے اثر سے فسق و فجور، شرک و بدعت کی لعنتوں سے دور رہے اور سب سے اہم اور قابل قدر بات یہ ہے کہ آج تک اس گاؤں میں نہ پارٹی بندی ہے نہ آپسی کوئی جھگڑا ہے، نہ مقدمہ بازی ہے، کوئی کسی کا یہاں مال نہیں غصب کرتا، کوئی کسی کی یہاں زمین نہیں دابتا۔ جھوٹی گواہی یا کسی کی بے عزتی یہاں شرمناک فعل سمجھا جاتا ہے۔

یہ فیض انھیں بزرگوں کا ہے جو کہ وقتاً فوقتاً اس مقدس زمین پر جنم لیتے رہے اور اپنے حسن اخلاق سے لوگوں کے دلوں کو منور کرتے رہے۔ دین کی روشنی بخشی اور دنیا میں ایماندار آدمی کی طرح رہنے کا سلیقہ سکھاتے رہے۔ چھوٹے چھوٹے زمینداروں کا یہ گاؤں غریب ضرور ہے لیکن دنیا کی لعنتوں سے پاک ہے۔

مولانا مرحوم کی گھریلو زندگی کے حالات تشنہ رہ جائیں گے اگر ان کی قناعت پسندی، صلح جوئی، انسانیت نوازی اور توکل علی اللہ کے کچھ واقعات سپرد قلم نہ کر دئے جائیں۔ غالباً ۳۸ء یا ۳۹ء میں کسی علمی اجتماع میں شرکت کے لئے وہ حیدر آباد (دکن) تشریف لے گئے۔ وہاں ان کے شاگردوں اور نیازمندوں کی خاصی تعداد تھی۔ اُن لوگوں نے مولانا مرحوم کو اس بات پر رضامند کرنے کی بہت کوشش کی کہ وہ ایک گرانقدر رقم ماہوار وظیفہ کے طور پر قبول کرلیں اور اس طرح اپنے شاگردوں کو کچھ خدمت وسعادت کا موقع دیں مگر مولانا نے اسے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ جامعہ کے اُس دور کے اساتذہ کی مالی پریشانیوں کا علم رکھنے والے اس کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایسی ہمت کرنے والے اللہ کے مقرب ترین بندے ہی ہو سکتے ہیں۔

ایک واقعہ اور ہے جو اُن کی صلح جوئی اور صلہ رحمی کی روشن مثال ہے۔ مولانا مرحوم اپنے نانا کے مکان اور جائداد کے واحد وارث تھے۔ ان کا پورا خاندان نانا ہی کے گھر میں رہتا تھا۔ کچھ ناعاقبت اندیشوں کے ورغلانے پر اُن کے نانا کے دور کے رشتہ داروں نے مکان کی ملکیت کا دعویٰ

کر دیا، مگر وہ لوگ مقدمہ ہار گئے، گاؤں کا ایک آدمی بھی ان کو اپنے [illegible]
سکا۔ مقدمہ ہار جانے کے بعد وہ لوگ اپنی غلط کاری کی معافی مانگنے آئے تو مولانا نے پورا مکان انہی لوگوں کو بخش دیا اور خود اپنے پورے خاندان سمیت اُسے خالی کر کے نکل آئے۔

سنہ ۱۹۴۰ء میں ایک بار وہ اپنے ایک دوست خان محمد اسلم خاں کے بلاوے پر مہینے ڈیڑھ مہینے کے لئے پشاور کے قریب کسی سرحدی قصبے میں گئے۔ خان محمد اسلم بہت بڑے زمیندار اور کئی باغات کے مالک تھے اور آزاد سرحدی علاقے میں بہت اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ اپنے ساتھ مولانا کو بھی آزاد علاقہ میں مختلف جرگوں کے سرداروں سے ملانے لے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز حکمران کی بھی ہمت اِن علاقوں میں داخل ہونے کی نہیں تھی۔ ایک بڑے جرگہ کے سردار نے ان لوگوں کو اپنے یہاں کھانے پر بلایا۔ مہمان کی خاطر داری سے بڑھ کر ان پٹھانوں میں اور کوئی بڑا اعزاز نہیں ہے۔ چنانچہ یہ لوگ خان کی دعوت میں پہونچے۔ وہاں جانے کے بعد ان لوگوں کو یہ افسوسناک اطلاع ملی کہ جرگہ کے بڑے سردار اور ان کے بھتیجے میں بہت شدید اختلاف پیدا ہو گیا ہے اور اس بات کا خطرہ ہے کہ جرگہ میں کوئی زبردست خون خرابہ نہ ہو جائے۔ یہ بات بہت ہی تکلیف دہ تھی چنانچہ مولانا بہت افسردہ خاطر ہوئے، مگر انھوں نے بڑی ہمت اور جرأت کا مظاہرہ کیا، یعنی جب دسترخوان پر کھانے کے لئے لوگ بیٹھے تو بسم اللہ مہمان خصوصی کو کرنا تھی اور یہ بڑی سعادت و برکت کی بات سمجھی جاتی تھی، مگر انھوں نے کھانے سے ہاتھ روکے رکھا۔ بڑے خاں یعنی سردار صاحب کو اس بات پر بڑا تعجب ہوا، انھوں نے دریافت کیا کہ محترم مہمان نے کس لئے ایسا کیا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ چچا بھتیجے کا تعلق باپ بیٹے کے تعلق کے برابر ہوتا ہے اور ان دونوں میں اختلاف غیر شرعی ہے، یہ بات نہ خدا کو پسند ہے نہ رسولؐ کو۔ اس لئے آپ اپنے بھتیجے کو اس دسترخوان پر بلائیے تو میں کھانا شروع کروں گا۔

بالآخر معزز مہمان کی بات کی پاسداری اور لحاظ کر کے بڑے خان نے شرط منظور کر لی، بھتیجے کو بلایا گیا دونوں چچا بھتیجے گلے ملے شکوے گلے سب دُور ہوئے اور سب لوگوں نے ہنسی خوشی مل کر کھانا کھایا اور کے لوگ ایک زبردست خونریزی سے بچ گئے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی خوشنودی بھی انھیں نصیب ہوئی۔

مولانا اسلم جیراجپوری مرحوم آج ہم میں نہیں ہیں مگر ان کی زندگی ہم سب کے لئے چراغِ راہ ہے اور ان کی یاد ہمارے دلوں میں ایک شمع کی طرح روشن ہے اور رہے گی

معین الدین حارث

اُستاذ محترم

مولانا محمد اسلم جیراج پوری

ماہنامہ "جامعہ" کی جنوری کی اشاعت میں اس اعلان سے دلی مسرت ہوئی کہ میرے محترم استاذ مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری مرحوم کی پیدائش کو سو سال پورے ہو رہے ہیں اور اس موقع پر مرحوم کی یاد میں "جامعہ" کا ایک خصوصی شمارہ شائع ہوگا۔ اسی وقت جی چاہا کہ اس تاریخی موقع پر مرحوم کی یاد کے ساتھ اپنی جامعہ کی طالب علمی کے کچھ واقعات قلم بند کر کے مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کروں۔ اس کے بعد محترم ضیاء الحسن فاروقی صاحب اور عبداللطیف اعظمی صاحب کا بذریعہ خط یہ حکم صادر ہوا کہ میں بھی جامعہ کے اس نمبر کے لئے اپنے تاثرات تحریر کروں کیوں کہ مجھے مولانا اسلم مرحوم کی شاگردی کا شرف حاصل رہا ہے۔

دیگر اہل علم و فضل اور مرحوم سے گہرا تعلق رکھنے والے مرحوم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر خاطر خواہ روشنی ڈال کر اس نمبر کی شان اور افادیت میں ضرور اضافہ کریں گے۔ میرا کام صرف یہ ہے کہ مرحوم کے ایک ادنیٰ شاگرد کی حیثیت سے جس نے اپنی جامعہ کی طالب علمانہ زندگی میں پورے چار سال مرحوم کے درسِ قرآن سے فیض حاصل کیا، اس دور کے کچھ واقعات کی یاد تازہ کروں اور اس طرح مرحوم کو اپنا خراج عقیدت بھی پیش کروں۔ میرا اپنا تعلیمی سلسلہ کسی حد تک کچھ عجیب سا رہا، خاندانی روایات کے مطابق ناظرہ کلام مجید گھر ہی پر ختم کیا اور یہ سعادت ٹونک کے حافظ علیم اللہ صاحب مرحوم سے حاصل کی۔ اس کے بعد اپنے گاؤں کے مکتب میں بنارس کے مولوی غلام مصطفےٰ صاحب مرحوم سے اردو کی چار کتابیں اور پھر قدرے فارسی پڑھی جس میں شیخ سعدی کی گلستاں اور بوستاں شامل تھیں، اس میں بھی تین چار سال کی

مدت گذری، نئے تعلیمی نظام میں علاقائی زبانوں کی اہمیت اب تسلیم کی جاچکی ہے اور اس پر بجا طور پر زور دیا جا رہا ہے۔ اس زمانے میں اس صورت کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ مگر والد مرحوم نے یہ ضرورت بھی محسوس کی کہ ہمارے علاقے کی زبان مراٹھی ہے اور اس سے غفلت نہ برتی جاتے، چنانچہ اردو مکتب سے فرصت پاکر چند سال گاؤں کے مراٹھی اسکول میں گذارے اور پانچویں جماعت تک اس زبان کی بھی تعلیم پائی جس کی وجہ سے مراٹھی میں تحریر و تقریر کی صلاحیت پیدا ہوئی جو بعد کی زندگی میں بہت کام آئی۔ جب ثانوی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو مختلف وجوہ سے یکے بعد دیگرے کئی اسکول تبدیل کرنے پڑے اور ثانوی انگریزی تعلیم کا نصف حصہ مراٹھی میڈیم کے ذریعہ اور بقیہ نصف اردو میڈیم کے ذریعہ پورا کیا۔

۱۹۲۰ء تحریک خلافت کے آغاز کا سال تھا، والد مرحوم نے اپنے کپڑے کی تجارت میں بدیسی کپڑے کی فروخت بند کرنے پر عمل کیا اور میں نے بمبئی کے سرکاری ثانوی اسکول الفنسٹن ہائی اسکول کا مقاطعہ کیا۔ چند ماہ مجبوراً گھر ہی پر بیٹھا رہا مگر خدا کا شکر ہے کہ مرکزی خلافت کمیٹی نے جس کا صدر دفتر بمبئی میں تھا، مصطفیٰ کمال پاشا ہائی اسکول کے نام سے اردو میڈیم کا ایک ہائی اسکول قائم کیا جس کا الحاق جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ سے تھا، میں نے اس اسکول میں داخلہ حاصل کرکے وہیں سے جامعہ کا امتحان میٹرک پاس کیا۔

اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے جامعہ کا رُخ کیا اور ۱۹۲۳ء میں علی گڑھ پہونچا۔ جامعہ جن حالات میں قائم ہوئی تھی اُن میں درحقیقت یہ اس کے بانیوں، خصوصاً مولانا محمد علی مرحوم کی جو جامعہ کے پہلے شیخ الجامعہ بھی تھے بالغ نظری اور وسیع الخیالی تھی جس نے ایسے اساتذہ کو جمع کر دیا تھا جن میں سے ہر ایک اپنے مضمون میں کامل مہارت کے ساتھ ان اوصاف سے متصف تھا جو ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے اس تعلیمی خطبے میں مذکور ہیں جس کا عنوان "اچھا استاد" ہے۔ جب اپنے دور کے جامعہ کے اساتذ کو یاد کرتا ہوں تو ان میں مولانا اسلم مرحوم کے علاوہ مولانا محمد السورتی مرحوم جو دینی علوم کے مسلّم استاد ہونے کے علاوہ عربی لغت و ادب اور صرف و نحو کے مسلم الثبوت ماہر تھے، خواجہ عبدالحیٔ فاروقی مرحوم جو دیوبند کے شیخ الہند مولانا محمود حسن مرحوم جن کے دستِ مبارک سے جامعہ کا افتتاح ہوا تھا، ارشد تلامذہ میں سے تھے اور جنھوں نے اس دور میں کلام مجید کی متعدد سورتوں کی تفسیر شائع کی تھی

رجو کافی مقبول ہوئی تھی، مولانا محمد علی شاہ صاحب سندھی جو حدیث کا درس دیا کرتے تھے اور مولانا سید شرف الدین ٹونکی جو اردو کے بلند پایہ شاعر تھے اور ابتداء میں یاسؔ اور بعد میں مومن تخلص کرتے تھے، انگریزی کے لئے پروفیسر ماسٹر جو بمبئی کے پارسی تھے، تاریخ اور سیاسیات کے لئے کیرالا کے پروفیسر ای، جی کیلاٹ صاحب اور انگریزی ادب اور معاشیات کے پروفیسر طاہر الیس محمدی خصوصیت سے یاد آتے ہیں۔

جامعہ نے جب ۱۹۲۵ء میں علی گڈھ سے دلی ہجرت کی تو وہ برسوں (اوکھلہ کے موجودہ جامعہ نگر کی طرف ہجرت ثانیہ سے قبل) نواح دلی میں قرول باغ میں قیام پذیر رہی۔ وہاں مذکورہ بالا اساتذہ کی صف میں تین اساطین کا اضافہ ہوا یعنی ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم، ڈاکٹر سید عابد حسین مرحوم اور پروفیسر محمد مجیب۔ پھر ان سب نے مل کر انجمن تعلیم ملی کی بنیاد ڈالی۔ اسی جماعت کی عمر بھر کی محنت شاقہ اور بے مثال قربانیوں کی وجہ سے جامعہ زندہ نہ رہ سکی اور اس نے مزید ترقی بھی کی —— میں اپنے حق میں اس بات کو اللہ کا بھاری کرم تصور کرتا ہوں کہ تعلیم کے ہر دور میں مجھے اچھے اساتذہ نصیب ہوتے اور ان سے علاوہ درسی تعلیم پانے کے میں ان کے بلند اخلاق اور کردار سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوا۔

اس دور میں جامعہ میں یہ دستور تھا کہ جو طلباء میٹرک کا امتحان پاس کر کے، خواہ وہ جامعہ کے ہوں یا اور کسی یونیورسٹی کے، کالج کی تعلیم کے لئے داخلہ لیتے تھے، انھیں پہلا سال ایک ابتدائی یا پریلیمنری کلاس میں گذارنا پڑتا تھا تاکہ وہ بعض ایسے مضامین کی جو اس سے قبل نہ پڑھ سکے ہوں، ضروری تعلیم حاصل کر کے جامعہ کے ڈگری کورس میں شامل ہو سکیں، ڈگری کورس کی مدت اس ابتدائی سال کے بعد مزید تین سال کی تھی۔ مولانا اسلم اس جماعت کو کلام مجید کا درس دیا کرتے تھے اور اس درس کا سلسلہ پورے ڈگری کورس تک جاری رہتا تھا۔ اس مدت میں پورے کلام مجید کا ترجمہ ضروری تفسیر کے ساتھ پورا ہو جاتا تھا۔ قرآنی علوم پر مرحوم کو جو عبور حاصل تھا اور اس وحی ربانی پر ان کی جو گہری نظر تھی وہ محتاج بیان نہیں، پھر چونکہ وہ خود ایک غیر معمولی طرز کے حافظ کلام اللہ تھے اس لئے درس کے وقت انھیں کلام مجید کا نسخہ سامنے رکھنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ البتہ ہر طالب علم کے سامنے کلام مجید ضرور ہوتا تھا۔ میں جس بات کی طرف خصوصی اشارہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ مولانا اسلم صاحب کا حفظ کلام اللہ اس پایہ کا تھا کہ کسی بھی آیت کا ترجمہ یا تفسیر کرتے وقت انھیں

زیر درس آیات سے متعلقہ موضوع کی دوسری آیات خود بخود یکے بعد دیگرے یاد آتی جاتی تھیں اور وہ ان آیات کو دہراتے جاتے تھے اور طلبا کی سہولت کے لئے ایسے طالب علم سے جو ان کے قریب بیٹھا ہو (اور یہ سعادت بسا اوقات میرے حصے میں آتی تھی) فرمایا کرتے تھے " ذرا دیکھنا تو اس پارے میں جہاں فلاں سورۃ ہے، رکوع نمبر فلاں میں، یہ آیت ابتدا میں. وسط میں یا آخیر میں ملے گی "۔ ناممکن تھا کہ مولانا مرحوم نے جس آیت کا حوالہ دیا ہو وہ کلام پاک کے اس پارے، اس سورۃ اور اس کے اس رکوع میں اور اس مقام پر جس کی انھوں نے نشان دہی کی ہو، نہ ملے۔

قرآن مجید میں بعض آیات کے ناسخ و منسوخ کی بحث آتی ہے اور ایسی آیات کی تعداد جو ابتداءً تعداد میں بہت بتائی جاتی تھیں بعد میں کم ہوتی گئی ہے جہاں تک مولانا اسلم صاحب کا تعلق تھا وہ ان قرآنی آیات میں جو بظاہر ایک دوسرے سے مختلف معلوم ہوتی ہوں تطابق کے قائل تھے، اور کسی بھی آیت کو منسوخ نہیں مانتے تھے۔ بعض مسائل میں مولانا اسلم کی رائے عام رائے یا دیگر علماء سے متفق نہیں تھی۔ مثال کے طور پر وراثت کے سلسلے میں وہ محجوب الارث کے قائل نہیں تھے اور اس عام رائے کو غیر صحیح بتاتے تھے کہ اگر کسی فرد کی متعدد اولادوں سے کوئی بیٹا اگر اپنے باپ کی زندگی میں فوت ہو جائے تو اس کی اولاد کو محجوب الارث قرار دے کر پوتے کو دادا کی وراثت پانے سے محروم کر دیا جائے۔ اس موضوع پر مولانا نے عربی میں اپنا ایک طویل مضمون الوراثت فی الاسلام کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا تھا۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اردو و فارسی کے علاوہ مولانا اسلم صاحب کو عربی زبان پر بھی کامل عبور حاصل تھا۔

مولانا اسلم مرحوم کی زندگی میں ان کے بعض خیالات سے علمی اور دینی حلقوں میں اظہار اختلاف بھی ہوا اور ان کے جواب میں مولانا اسلم اپنے خیال کی موافقت میں اپنا زور قلم صرف کرتے رہے، ان کے بعض شاگردوں کو بھی بعض مواقع پر ان سے اختلاف رہا اور ان میں سے بعض کا ادب و احترام کے ساتھ اظہار بھی کیا۔ مولانا اسلم اس قسم کی بحثوں کو علمی سطح تک ہی محدود رکھتے تھے۔ اور ان میں ذاتیات کو دخل نہیں دیتے تھے۔ ان کی وسیع النظری، فراخدلی اور رواداری کا یہ حال تھا کہ جہاں اپنی رائے پر پختگی کے ساتھ جمے رہتے تھے وہیں فریق ثانی کا اپنی رائے رکھنے کا پورا حق بھی تسلیم کرتے تھے۔ د اوقات دینی، علمی اور غیر علمی بحثوں میں بھی ذاتیات پر اُتر آنے کی جو عادت پائی جاتی ہے اس سے اگ

اجتناب کیا جائے تو نہ صرف ان تلخیوں سے بچا جا سکتا ہے جو ایسی بحثوں میں پیدا ہو جاتی ہیں بلکہ تحقیق حق یا حق بات تک پہنچنے میں بھی بڑی مدد مل سکتی ہے۔

مولانا مرحوم ائمہ اربعہ میں سے لازمی طور پر کسی ایک کی ہر مسئلے میں تقلید کے قائل نہ تھے گو ان کے دل میں احترام سبھی کا تھا، اس لحاظ سے ان کا مسلک جماعت اہل حدیث سے قریب تر تھا مگر بعض لوگ، انھیں اہل قرآن بنا کر ان کی بابت نعوذ باللہ حدیث سے انکار کا شبہ بھی ظاہر کرتے تھے۔ بات صرف یہ تھی کہ وہ قرآن و حدیث کو ایک سا اور برابر کا درجہ دینے کے قائل نہ تھے اور ایسے بنیادی دینی مسائل میں جن کا عقیدے اور حلال و حرام سے تعلق ہو صرف قرآن کریم کو ناطق مان کر اس کو اولیت کا درجہ دیتے تھے۔

مولانا اسلم مرحوم کو اسلامی تاریخ اور اس کے مطالعے سے گہرا لگاؤ تھا۔ انھوں نے تاریخ الامت لکھی جو آٹھ حصوں میں شائع ہوئی۔ اس میں سیرت نبویؐ اور سیرت خلفائے راشدینؓ کے بعد ہر دور کی اسلامی تاریخ، حتیٰ کہ خلافت عثمانی کی تاریخ بھی شامل ہے۔ ہر چند کہ اس طرز کے کام میں گذشتہ چودہ صدیوں کی اسلامی تاریخ کا پوری شرح و بسط کے ساتھ احاطہ مشکل ہے، مگر تسلسل کے ساتھ خواہ اختصار ہی سے سہی پوری اسلامی تاریخ پر نظر ڈالنی ہو تو یہ سلسلہ اُس دور میں، خاص طور پر طلباء کے مطالعے کے لئے مفید تھا اور آج بھی مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

اردو، فارسی اور عربی پر قدرت کے ساتھ ساتھ مولانا اسلم کو شاعری کا بھی ذوق تھا اور اردو اور فارسی میں ان کا کلام موجود ہے۔ مگر شاعری ان کے لئے ضمنی حیثیت رکھتی تھی اور مولانا شبلی کی طرح وہ بھی قومی نظمیں کہا کرتے تھے جن میں سے بعض کو تحریک خلافت کے دور میں غیر معمولی قبول عام حاصل ہوا تھا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ بمبئی جیسے شہر میں مجلس خلافت کے عام جلسوں میں خلافت کے ایک خوش گلو کارکن جن کا نام اختر صاحب تھا اور جو علی گڑھ کے تھے، جلسے کی کارروائی اور تقریروں کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے قومی نظمیں بڑے جوش کے ساتھ سنایا کرتے تھے جن سے سامعین نہ صرف محظوظ ہوتے تھے بلکہ ان کی دینی حرارت اور قومی جوش میں وقتی طور پر ہی سہی، اضافہ ہوتا تھا۔ ایسے کلام میں جو میں نے بمبئی میں خلافت کے جلسوں میں انھی

اختر صاحب سے سنا تھا، بسملؔ کی وہ مشہور غزل پہلی بار سُنی تھی جس کا مطلع اور مقطع حسب ذیل ہے:

سرفروشی کی تمنّا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے
اب نہ پہلے ولولے ہیں اور نہ ارمانوں کی بھیڑ
صرف مٹ جانے کی اک حسرت دلِ بسملؔ میں ہے

اس کے ساتھ وہ مولانا اسلم مرحوم کی ایک نظم بھی سنایا کرتے تھے جس کا عنوان "تمغۂ ایمان" ہے اور جس کا مطلع ہے:

دہر میں مسلم ہے حق کی آزمائش کے لئے
تمغۂ ایماں نہیں ملتا نمائش کے لئے

اس کے بعد چند اشعار میں جلیل القدر انبیاء کرام مثلاً حضرت یعقوب، حضرت یوسف اور حضرت ایوب علیہم السلام، اور حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جن مصائب اور آزمائشوں سے گذرنا پڑا ان کا ذکر تھا۔ اور مطلع اور چند دوسرے اشعار کی طرح اس نظم کا آخری شعر بھی مجھے یاد رہ گیا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے بعض کٹھن اور سخت آزمائشی مواقع پر جن سے شاید ہی کوئی انسانی زندگی خالی ہو، اس حکیمانہ شعر نے ڈھارس بندھائی ہے اور صبر و شکر سے کام لینے میں جو کوئی آسان بات نہیں ہوتی، بڑی مدد کی ہے۔ مولانا اسلم کی اس نظم کا وہ آخری شعر یہ ہے:

آزمائش ہے نشانِ بندگانِ محترم
جانچ ہوتی ہے اسی کی جس پہ ہوتا ہے کرم

علم و فضل، تصنیف و تالیف اور شعر و سخن کے ساتھ دلچسپی کا مولانا اسلم مرحوم نے وافر حصہ پایا تھا اور جامعہ کے ان طلباء کو جنھیں ان کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا اور ان اہلِ علم کو جو اُن کی صحبت سے فیض یاب ہوئے اور جو ان کی وفات پر ربع صدی سے زائد عرصہ گذر جانے کے بعد بھی ان کی عقیدت مندی کا دم بھرتے ہیں، اس بات کا بھی علم ہے کہ مولانا اسلم نہ صرف

ایک راسخ العقیدہ عالم تھے بلکہ صحیح معنوں میں عالم باعمل بھی تھے۔ انھیں شریعت حقہ کی پابندی ور عبادات کا کتنا خیال رہتا تھا اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے میں صرف ایک بات عرض کرتا ہوں:

نماز باجماعت کی پابندی کا مولانا اسلم مرحوم کو اس درجہ خیال تھا کہ وہ اپنے لئے جب رہائشی مکان تلاش کرتے تھے تو اور باتوں کے علاوہ یہ خیال رہتا تھا کہ رہائش گاہ مسجد سے زیادہ دور نہ ہو تاکہ اذان کی آواز کان میں پڑتی رہے اور نماز جماعت کے ساتھ ادا ہو سکے۔ قرول باغ میں مولانا کے قیام کے دور سے جو اصحاب واقف ہیں وہ اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ اس زمانے میں جب آج کل کی طرح رہائشی مکانوں کی قلت نہ تھی بلکہ بنے بنائے وسیع گھر کرایہ داروں کے انتظار میں خالی پڑے رہتے تھے اور رہائشی مکان کی تبدیلی معمولی بات تھی، مولانا اسلم مرحوم نے قرول باغ میں اپنے لئے رہائش گاہ جب بھی تلاش کی تو انھیں اس بات کا خیال رہا کہ اللہ کا گھر ان کی رہائش گاہ سے زیادہ دور نہ ہو اور اذان کی آواز کان میں پڑتی رہے۔

غالباً اپنی اسی عادت کی بنا پر جب اوکھلا میں جامعہ کی بستی بسی اور جامعہ نگر آباد ہوا ور بعض اساتذہ نے بھی اپنے لئے رہائشی مکانات تعمیر کرنے کے لئے زمین کے چھوٹے موٹے قطعے حاصل کئے تو مولانا اسلم کو بھی یہ ضرورت محسوس ہوئی، انھوں نے بھی ایک چھوٹا سا قطعہ زمین حاصل کر کے ایک مختصر سا مکان تعمیر کرایا جس قطعۂ زمین پر ان کی نظر پڑی وہ جامعہ کی اس وقت کی بستی کا آخری سرا تھا اور اس کی سرحد اوکھلا گاؤں کی سرحد سے ملتی تھی اور جہاں گاؤں کی مسجد کی اذان کی آواز پہونچتی تھی۔ آج بھی وہ مختصر مکان اسی جگہ موجود ہے اور غالباً ان کے لائق فرزند ڈاکٹر محمد معظم صاحب کی ملک میں ہے۔ اب تو آبادی کی کثرت سے اوکھلا اور جامعہ نگر کا نقشہ ہی بدل گیا ہے۔ جب کبھی دہلی اور جامعہ نگر جانے کا اتفاق ہوتا ہے اور اس مکان سے گذرنے والی سڑک سے گذرتا ہوں تو مولانا اسلم مرحوم مجھے اور زیادہ یاد آتے ہیں ور اس کے ساتھ اپنی رہائش گاہ کو مسجد سے قریب رکھنے کی ان کی سنت بھی یاد آتی ہے۔

اب تو اس بستی میں بھی کئی مسجدیں ہیں اور خود جامعہ کی اپنی شاندار مسجد بھی تعمیر ہو چکی ہے جو اپنے موقع و محل اور اپنے مخصوص طرز تعمیر کی وجہ سے اس شاہجہاں آباد میں

جس میں گذشتہ صدیوں کے مختلف ادوار میں تعمیر شدہ شاندار مساجد اب بھی موجود اور آباد ہیں، اپنے حسن تعمیر اور دیدہ زیبی کی بناء پر نہ صرف جامعہ نگر کی بلکہ پورے دہلی کی جو اب میلوں تک پھیل چکی ہے، شان دو بالا کرتی ہے۔ جامعہ نگر کا چپّہ چپّہ ان اساتذہ کرام کی یادگاروں سے بھرا ہوا ہے جن کی انتھک کوشش اور بے مثال ایثار و قربانی سے یہ نوزائیدہ ادارہ قائم رہا اور ترقی کرتا گیا، ان میں سے بشمول استاذی ڈاکٹر ذاکر حسین اسی جامعہ کی خاک میں آرام فرما ہیں۔ مولانا اسلم جیراجپوری بھی جو علمِ دین کا بہت بڑا خزینہ تھے، جامعہ کے قبرستان ہی میں دفن ہیں۔ میں جب کبھی اپنے ان اساتذہ کرام، جو وہیں مدفون دیگر بزرگانِ ملّت اور اپنے متعدد ہم جماعت ساتھیوں کی قبروں پر فاتحہ خوانی کے لئے حاضر ہوتا ہوں تو ایسے ہر موقع پر مجھے مولانا حالی کا وہ شعر یاد آتا ہے جو انھوں نے اپنے دہلی کے تاریخی نوحے میں لکھا تھا اور جو موجودہ حالات پر بہت زیادہ صادق آتا ہے :

آج جس جنسِ گراں کا اس جہاں میں کال ہے
تیرا قبرستان، دلّی، اس سے مالا مال ہے

"تصوّف بجائے خود عشق ہے لیکن وہ عشق نہیں جس کو بوالہوسی یا نظر بازی کہتے ہیں، بلکہ اصلی عشق جس میں انسان جمالِ حقیقی کی شمع کا پروانہ ہوکر اپنی ہستی کو جلا کر خاک کر دیتا ہے۔"

(حیاتِ جامی صفحہ ۱۵) مولانا محمد اسلم

مشیر الحق

مولانا اسلم کی "تاریخ القرآن": ایک جائزہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کی دوسری سالگرہ کے موقع پر (۷ ربیع الاول ۱۳۴۱ھ مطابق ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۲ء) مولانا اسلم جیراجپوری نے مطبع فیض عام علی گڑھ سے اپنی مختصر مگر جامع "تاریخ القرآن" کو اس نوٹ کے ساتھ شائع کیا کہ "میں نے یہ کتاب ۱۳۲۵ھ (۱۹۰۷ء) میں لکھی تھی جبکہ میری عمر بھی کم تھی اور میرا علم بھی اب سے زیادہ محدود تھا۔" مولانا کے بیان کے مطابق کیا یہ وقت "بعض بعض اسلامی کالجوں اور اسکولوں کے دینیات کے نصاب میں داخل کر دی گئی تھی"، لیکن بعض وجوہ سے یہ کتاب خود ان کی نظروں سے گر گئی تھی اس لئے وہ ضرورت اور طلب کے باوجود اسے دوبارہ شائع کرنا پسند نہیں کرتے تھے مگر "احباب کے اصرار اور قوم کے پیہم تقاضے" سے مجبور ہو کر انھوں نے پہلے اڈیشن پر نظر ثانی کی اور غیر ضروری باتوں کو خارج کر کے ضروری مضامین کے اضافہ کے ساتھ اسے شائع کیا۔ اس سلسلے میں اہم ترین بات انھوں نے یہ کی کہ تاریخ القرآن کو دوبارہ مرتب کرنے میں خود قرآن ہی سے زیادہ مدد لی۔ ہمارے سامنے اس کتاب کا پہلا اڈیشن نہیں ہے اس لئے یہ بتانا مشکل ہے کہ آخر اس اڈیشن میں وہ کون سی ایسی باتیں تھیں جن کی وجہ سے مولانا اپنی کتاب سے غیر مطمئن تھے۔ صرف گمان کیا جا سکتا ہے کہ پہلے اڈیشن میں مولانا نے احادیث اور تاریخ وسیر کی کتابوں پر زیادہ تکیہ کیا ہو گا۔ دوسرے اڈیشن کی اشاعت کے وقت تک احادیث کے سلسلے میں ان کی فکر میں تبدیلیاں آنے لگی تھیں جیسا کہ انھوں نے اس کتاب کے صفحہ ۱۰۰ پر لکھا ہے کہ "حدیث کا تو ثبوت بھی باجماع علماء رسالت مآب تک یقینی نہیں بلکہ ظنی ہے۔" مولانا کے اس بیان میں "باجماع علماء" بطور خاص نوٹ کرنے کے قابل ہے۔ علماء مولانا کے اس بیان سے متفق نہیں ہوں گے کیونکہ ان کے

بقول اصول روایت اور درایت کی رو سے جو حدیثیں صحیح ثابت ہو جائیں تو رسالت مآب تک ان کے پہنچنے کا ثبوت ظنی سے بڑھ کر یقینی کے حدود میں داخل ہو جاتا ہے ۔ بہر حال اب چونکہ مولانا آہستہ آہستہ اپنی خاندانی "اہلحدیث" روایات سے ہٹتے جا رہے تھے اس لئے تاریخ القرآن کی دوسری اشاعت کے وقت وہ لامحالہ یہ سوچنے لگے ہوں گے کہ تاریخ القرآن کی بنیاد جس حد تک ممکن ہو خود قرآن کو بنایا جائے ۔ ظاہر ہے کہ آنحضرت صلعم کے وصال کے بعد پیش آنے والے واقعات پر حدیثوں کے بغیر روشنی نہیں ڈالی جا سکتی ۔ اس لئے مولانا نے بھی مثلاً جمع و ترتیب قران ایسے مسائل میں تو حدیثوں پر تکیہ کیا ہے کہ اس کے بغیر چارہ نہیں ، ویسے بحیثیت مجموعی ان کی کوشش یہی رہی ہے کہ قرآن ہی کو مآخذ کے طور پر استعمال کریں ۔

مولانا بھی دوسرے اہل علم کی طرح وحی کی چار صورتیں بتاتے ہیں ۔ (۱) رویائے صادقہ ("جس کے ذریعہ اصول شریعت کی تلقین نہیں ہوتی" ص ۱۳) (۲) احکام کا بلا واسطہ نبی کے دل پر القا (۳) نبی سے براہِ راست تخاطب (۴) فرشتے کے ذریعہ تنزیل ۔ عام علماء اور محققین اس بات کے قائل ہیں کہ قرآن کا نزول آخر الذکر تینوں ذریعوں سے ہوا ہے (مثلاً ملاحظہ ہو سورہ الزخرف ۴۳ : آیات ۵۱، ۵۲ کی تشریح : "ترجمہ قرآن مجید" از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ، مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن ، لاہور ، ص ۱۲۳۱) ۔ مولانا اسلم کو اس خیال سے اتفاق نہیں تھا ۔ انھوں نے وحی کی مذکورہ بالا چاروں قسموں کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد قرآن کی مختلف آیات کا سہارا لیتے ہوئے یہ کہا ہے کہ قرآن صرف چوتھے طریقے کے مطابق جبرئیل امین کے ذریعے آنحضرت صلعم پر نازل کیا گیا تھا ۔

بیشتر فقہا اور محققین ، قرآن میں نسخ کے قائل ہیں ۔ ان کی تحقیق کے مطابق نسخ کی تین قسمیں ہیں :

(۱) منسوخ الحکم والتلاوۃ (وہ آیات جن کی تلاوت اور حکم دونوں منسوخ ہیں) مثلاً صحیحین میں حضرت انس بن مالک سے اصحاب بئر معونہ کے بارے میں مروی ہے کہ جب وہ لوگ شہید کیے گئے تو نبی صلعم ان کے قاتلوں پر قنوت پڑھا کرتے تھے اور ان کے متعلق یہ قرآن نازل ہوا تھا :

بلّغوا عنّا قومنا انّا لقينا ربّنا فرضی عنّا و ارضانا	ہماری قوم کو ہماری طرف سے یہ خبر پہونچا دو کہ ہم اپنے رب سے ملے وہ ہم سے راضی ہوا اور اس نے ہمیں خوش کر دیا۔

(۲) منسوخ التلاوت (وہ آیات جن کا حکم باقی ہے لیکن وہ قرآن میں موجود نہیں ہیں کیونکہ ان کی تلاوت منسوخ کر دی گئی ہے) مثلاً شادی شدہ زانیوں کے لئے رجم کا حکم، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ قرآن میں پہلے "رجم" کا حکم موجود تھا، پھر اس آیت کی تلاوت تو منسوخ کر دی گئی لیکن حکم علی حالہ باقی رہا۔

(۳) منسوخ الحکم (وہ آیات جو قرآن میں تو موجود ہیں لیکن ان پر عمل درآمد منسوخ کر دیا گیا ہے) مثلاً سورہ ۸ آیت ۶۵ میں ہے: "اگر تم میں سے ۲۰ صبر کرنے والے ہوں تو دوسو پر غالب آسکتے ہیں" اور اس کے بعد والی آیت (نمبر ۶۶) میں کہا گیا ہے: "اب اللہ نے تخفیف کر دی، اس نے دیکھا کہ تم میں کمزوری ہے، اب اگر تم میں سے سو ثابت قدم ہوں گے تو دوسو پر غالب آئیں گے۔"

مولانا اسلم قرآن میں نسخ کے بالکل قائل نہیں ہیں۔ نسخ کی پہلی قسم کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ خیال چند ضعیف اور موضوع روایات کی بنیاد پر پیدا ہوا ہے۔ صحیحین کی مذکورہ بالا حدیث کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ متاخرین کو حضرت انس کی روایت میں لفظ قرآن سے غلط فہمی ہوئی ہے۔ مولانا اس روایت کی توجیہہ یہ کرتے ہیں کہ عرف زبان میں ہر پڑھی جانے والی چیز کو "قرآن" کہتے ہیں۔ دراصل آنحضرت صلعم نے مذکورہ بالا جملہ شہدائے بئر معونہ کی زبان حال سے فرمایا تھا جسے لوگوں نے قرآن سمجھ لیا، اگر وہ قرآن کا جزء ہوتا تو آنحضرت اسے کاتبین وحی سے لکھواتے اور حفاظ اسے یاد کر لیتے، لیکن ایسا نہیں ہوا۔

نسخ کی دوسری قسم (منسوخ التلاوت) کو مولانا خلاف عقل کہتے ہیں اور یہاں بھی وہ یہی دلیل دیتے ہیں کہ اگر قرآن میں ایسی کوئی آیت ہوتی تو نا ممکن تھا کہ اس کی حفاظت نہ کی جاتی۔ رجم کے سلسلے میں حضرت عمر کی طرف جو روایت منسوب ہے کہ "ایک زمانہ ایسا آئے گا جب لوگ کہیں گے کہ رجم کا حکم کتاب اللہ میں نہیں ہے، حالانکہ اس میں رجم کا حکم دیا گیا ہے۔۔۔" مولانا کہتے ہیں کہ اس روایت

ں لوگوں کو "کتاب اللہ" کے لفظ سے دھوکا ہوا ہے۔ لوگوں نے اس کا مطلب قرآن سمجھا حالانکہ حضرت
ر کی مراد اس سے توریت تھی جو اسلامی عقیدہ کے مطابق کتاب اللہ ہے۔

منسوخ الحکم کے بارے میں مولانا کہتے ہیں کہ لوگوں نے اس کے بارے میں رائے اور قیاس
د اس قدر دخل دیا ہے کہ پچاسوں آیتوں پر نسخ کا حکم لگا دیا ہے۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ قائلین
نسخ علماء بھی منسوخ الحکم کہی جانے والی آیات کی تعداد پر متفق نہیں ہیں۔ ابن العربی نے غور وفکر
کے بعد ۲۱ "منسوخ الحکم" آیتوں کی تعیین کی ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے جب ان ۲۱ آیتوں پر مزید
غور کیا تو ۱۶ آیتوں کو انھوں نے اس فہرست سے خارج کر دیا اور فوز الکبیر میں صرف پانچ آیتوں
کو منسوخ الحکم قرار دیا۔ مولانا اسلم نے ان پانچوں آیتوں کو بھی منسوخ الحکم کی فہرست سے خارج
کر دیا ہے، اور ان سب میں تطبیق پیدا کی ہے۔ مثلاً ان پانچ آیات میں سے ایک آیت (جس کا ذکر
ہم اوپر کر چکے ہیں) کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ دونوں حکم اپنی جگہ باقی ہیں اور حالات کے تحت ان کا
اطلاق ہوگا۔ اگر کسی جگہ مسلمانوں کی تعداد کم ہوگی تو وہاں اللہ تعالیٰ کی نصرت سے بیس مسلمان بھی دو سو
کافروں پر بھاری ہوں گے اور جہاں ان کی تعداد زیادہ ہوگی وہاں زیادہ لوگوں کو مدافعت کی
خاطر نکلنا پڑے گا۔

ظاہر ہے جب مولانا نسخ ہی کے سرے سے قائل نہیں ہیں تو پھر احناف کے اس اصول کو
وہ کہاں تسلیم کر سکتے تھے کہ "حدیث آیاتِ قرآن کی ناسخ ہو سکتی ہے" مولانا اس اصول کو ناقابلِ
تسلیم کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ قرآن میں خود رسولِ اکرمؐ کی زبان سے کہلایا گیا ہے:

قُلْ مَا یَکُونُ لِیٓ اَنْ اُبَدِّلَہٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِی (سورۂ ۱۰، آیت ۱۵)

اے پیغمبر کہہ دے کہ مجھے یہ حق نہیں ہے کہ میں قرآن کی آیتوں کو اپنی طرف سے بدل دوں۔

اس واضح ارشاد خداوندی کے بعد کوئی شخص کس طرح یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ رسول اللہ صلعم
کو قرآن میں تصرف کا اختیار تھا اور وہ اس میں ادل بدل کر سکتے ہیں۔

قرآن کے حرفاً حرفاً محفوظ رہ جانے پر عقیدہ رکھنے کے باوجود اکثر یہ بات سننے میں آتی
ہے کہ حضرات شیعہ موجودہ قرآن کو نامکمل مانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جمع و ترتیب قرآن کے وقت

ن آیات کو خارج کر دیا گیا جن میں حضرت علی اور اہل بیت کے فضائل بیان کئے گئے تھے۔ مولانا اس
یال کی شدت سے تردید کرتے ہیں اور اپنے اس دعوے کو کہ موجودہ قرآن مکمل ہے اور اس میں
و بیشی قطعاً نہیں ہوئی ہے، داخلی اور خارجی شواہد کی بنیاد پر ثابت کرتے ہیں۔ اولاً تو وہ مختلف
ور کے شیعہ علماء کی رائے نقل کرتے ہیں جن میں یہ بات پوری شد و مد سے کہی گئی ہے کہ موجودہ
رآن مکمل ہے اور اس میں کسی قسم کی قطع و برید نہیں ہوئی (ص ۶۲-۶۷) شیعہ علماء کی رایوں کے
لاوہ مولانا اس بات پر بھی اصرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود اپنے
سر لیا ہے اس لئے نا ممکن ہے کہ قرآن کی کچھ آیات کو چھپا دیا گیا ہو۔
"تحریف" کے موضوع پر لکھتے ہوئے مولانا ان "بعض مصنفین اسلام"[1] سے اختلاف کرتے ہیں
جو بائبل میں تحریف لفظی کے بجائے صرف تحریف معنوی کے قائل ہیں۔ مولانا کی رائے میں
سابقہ کتب مقدسہ میں تحریف معنوی کے ساتھ ساتھ تحریف لفظی بھی کی گئی ہے کیونکہ قرآن
تحریف لفظی کا مدعی ہے :

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ "وہ الفاظ کو اپنی جگہ سے بدل دیتے ہیں"

(سورہ ۴، آیت ۴۶)

قرآن کے بارے میں مولانا کا عقیدہ ہے کہ اس میں کسی قسم کی تحریف نہ تو ہوئی ہے اور نہ تو
اس کا امکان ہے کیونکہ اس کا محافظ خود خدا ہے۔ ہاں قرآن کی وہ تفسیریں جن میں مفسرین
اپنے خاص عقائد کے اثبات کے لئے قرآنی آیات کی "ناجائز اور غلط" تاویلات کرتے ہیں
سراسر "تحریف معنوی" کے ضمن میں آتی ہیں۔ (ص ۱۰۸)

مولانا نے ۱۲۶ صفحات کی اپنی مختصر سی کتاب میں تاریخ اور مضامین قرآن دونوں ہی پر

---

[1] یہاں مولانا کا اشارہ غالباً سرسید کی طرف ہے جنھوں نے اپنی کتاب "تبیین الکلام" میں یہ ثابت کرنے کی
کوشش کی ہے کہ علمائے یہود و نصاریٰ نے بائبل میں صرف تحریف معنوی کی ہے۔ اس سلسلے میں ملاحظہ ہو،
کرسچین ڈبلیو ٹرال کی انگریزی کتاب "سید احمد خاں" (مطبوعہ وکاس پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی)
بطور خاص تیسرا باب "اسلام اور یہود و نصاریٰ کی کتب مقدسہ"۔

ایجاز کے ساتھ قلم اٹھایا ہے۔ یہ کتاب انھوں نے بظاہر طلبہ کے لئے لکھی تھی اسی وجہ سے حوالوں اور حاشیوں سے پرہیز کیا ہے۔ جو لوگ مولانا کے انداز بیان سے واقف ہیں وہ میری اس بات سے متفق ہوں گے کہ کتاب کی زبان سہل اور رواں دواں ہے اور "عالمانہ غموض" سے پاک ہے۔ اس کتاب کو مولانا نے اپنی ہی ایک نظم "شمع ملّت" کے آخری بند پر ختم کیا ہے جسے یہاں نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قرآن کے بارے میں ان کے جذبات و احساسات کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

چھوڑ کر قرآن کو مُسلم حق سے بیگانہ ہوا
دین کو بھی رُسوا کیا اور آپ بھی رُسوا ہوا
وہ کتابِ آسمانی مشعلِ راہِ نجات
نور کا اک چشمۂ روشن ہے جو بہتا ہوا
نسخۂ اکسیرِ جاں، داروے بیماریٔ دل
رحمتِ حق کا صحیفہ عرش سے اُترا ہوا
ظلمتِ باطل ہوئی کافور جس کے نُور سے
آشکارا شانِ حق کا دہر میں جلوا ہوا
گلّہ باں جس کی بدولت نائبِ حق ہوگئے
بوسہ گاہِ بادشاہاں جن کا نقشِ پا ہوا
آج بھی موجود ہے ہم میں وہی شمعِ ہدیٰ
کاش آئے راہ پر پھر کارواں بھٹکا ہوا
دیکھنا تم رقصِ مجنوں کا تماشا دشت میں
سامنے اس کے اگر پھر محملِ لیلیٰ ہوا
نور سے معمور پھر سارا جہاں ہوجائے گا
آسماں سے ابرِ رحمت دُر فشاں ہوجائے گا

ڈاکٹر شعیب اعظمی

"اسلم شیدائے طرز سخن"

مولانا محمد اسلم جیراجپوری جس عہد میں پیدا ہوئے وہ اگرچہ اپنی زبان حال سے فارسی زبان اور ادب کے زوال کی آخری داستان سنا رہا تھا، مگر اس وقت گزشتہ داستانوں کے زندہ جاوید کرداروں کے خدوخال اتنے دھندلے نہیں ہوئے تھے جتنے اب ہیں اور اسلامی معاشرہ میں تربیت پانے والا کوئی بتدی فارسی ادبیات کی تحصیل سے بے نیاز نہیں رہ سکتا تھا۔ مولانا نے مکاتب اور مدارس میں جہاں قرآن۔ عربی زبان وادب، حدیث، فقہ اور علم جغرافیہ کا درس ممتاز اساتذہ سے لیا اور اسلامی سوسائٹی کی مروجہ اور متداولہ تربیت پائی، وہیں تاریخی، ثقافتی اور تمدنی زبان فارسی بھی پڑھی۔ مولانا نے علوم اسلامی سے متعلق اپنے جن اساتذہ سے استفادہ کیا، ان کے ذکر کے ساتھ انھوں نے اپنے اُن استاد کا نام بھی لیا ہے جنھوں نے ان کو فارسی پڑھائی اور اُن کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کو پڑھ کر ان کے ذہن رسا اور ذوق شعر و ادب کو جلا ملی۔ فارسی کی ابتدائی کتابیں گلستاں اور بوستاں تھیں۔ خداداد قوت حافظہ کی بنا پر دونوں کتابیں ازبر اس لئے بھی ہوگئی تھیں کہ وہ ہر جمعرات کو دونوں کتابوں کے ایک ایک باب کا آموختہ زبانی سنایا کرتے تھے۔

مولانا مرحوم نے تھوڑی سی عمر میں ہی فارسی قواعد کی اتنی تحریری مشق کر لی تھی کہ ان مشقوں کو ایک رسالہ کی شکل دے کر اُسے "قواعدِ اسلمیہ" کے نام سے شائع کرادیا۔ فارسی کی دوسری کتابیں انھوں نے مولوی فتح اللہ سے پڑھیں مگر ذاتی ذوق و شوق سے مجبور ہوکر شعراء کے دواوین اور مثنویاں (مع شاہنامہ) پڑھ ڈالیں۔ بچپن کی اس فارسی دانی کو بھوپال کی شعری و ادبی فضا نے اور پختہ بنادیا، یہاں تک کہ مشہور شاعر مولانا احسن بلگرامی ملقب بہ "شاعرگر" کے رسالوں پنج سبق اور دہ سبق کے مطالعہ نے فارسی شعر گوئی کا چسکا لگا دیا جسے وہ اپنے والد کی سرزنش کے باوجود نہ چھوڑ سکے، اور اگرچہ انھوں نے باقاعدہ شاعری نہیں کی لیکن مختلف مواقع پر انھوں نے طبع آزمائی کے جو نمونے پیش کئے انھیں پڑھ کر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے

کہ مولانا اسلم کا فارسی سخن سنجی کا ذوق اُن کی عمر کے ساتھ اتنا بلند ہوتا گیا کہ انھوں نے فارسی ادب کے شہ پاروں اور مشاہیر شعراء کے کلام کے بارے میں جو کچھ سپردِ قلم کیا اس نے ان کو اپنے عہد کے اعلیٰ قسم کے محققین، نقادوں، علماء، فضلا، شعراء اور یونیورسٹیوں کے معروف اساتذہ کی صف میں لا کھڑا کیا۔

مولانا اسلم ایک عالم، مفسر، مورخ اور مترجم کی حیثیت سے درجنوں کتابوں کے مصنف ہیں۔ اُن کی ہر تصنیف اپنے میدان میں مکمل اور مستند ہے، جس موضوع پر لکھا فاضلانہ اور محققانہ لکھا، خصوصاً قرآن سے خاص شغف کی بنا پر قرآنیات سے متعلق جو کچھ لکھا وہ ان کی والہانہ عقیدت، دیدہ وری اور اجتہاد کا بیّن ثبوت ہے، عربی ادب و تاریخ کے علاوہ فارسی ادبیات سے متعلق ان کی جو قلمی کاوشیں ہیں، وہ ان کی محققانہ طبیعت، نقادانہ ذہن اور سلامتی ذوق کا ثبوت ہیں۔ ان کی طبیعت کا یہ خاصہ ان کی تصنیفات کے ہر ورق سے ظاہر ہے اور ان کی ناقدانہ بصیرت کی مثالیں جا بجا بکھری پڑی ہیں۔[۱] اپنی اس افتادِ طبع اور روش کے بارے میں لکھتے ہیں :

> "میری طبیعت میں کچھ تو تنقید کا مادہ ہے اور کچھ والد کی تعلیم نے اس سونے پر سہاگے کا کام کیا جو بار بار یہ حقیقت ذہن نشین کراتے رہتے تھے کہ سوائے ان چیزوں کے جن پر تم ایمان لائے ہو، ہر شئے پر تم کو تنقید کا پورا حق حاصل ہے، اسی لئے میں نے ان مصنفوں کی بزرگی کا لحاظ رکھتے ہوئے بھی ان کی جن باتوں کو غلط سمجھتا تھا ان پر اعتراض کرتا تھا۔[۱]"

ہر چند ان کا یہ قول کچھ مخصوص مضامین کے بارے میں تھا مگر لیکن یہ عجیب اتفاق ہے اور شاید یہ فارسی ادبیات، خصوصاً فارسی شاعری کا اعجاز تھا کہ مولانا اسلم نے جب بھی کوئی فارسی موضوع منتخب کیا تو ہمیشہ اس کے محاسن اور روشن پہلو پر نظر ڈالی۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں جب وہ علی گڑھ کی لٹن لائبریری کے شعبۂ مشرقیات کے نگراں مقرر ہوئے اور پھر پروفیسری کے ممتاز عہدہ پر فائز ہوئے تو ان کی نقادانہ طبیعت، محققانہ نظر اور ذوقِ شعری نے پہلے پہل دنیائے فارسی کے مشہور شاعر حافظ شیراز کو منتخب کیا، نتیجہ میں ۱۹۰۸ میں حیاتِ حافظ لوگوں کے ہاتھوں میں تھی۔ حیاتِ حافظ وہ شخص لکھ رہا ہے جو امت کی تاریخ کے بحرِ بیکراں کا شناور، تعلیماتِ قرآنی کا پیرو اور عربی زبان و ادب کا متبحر عالم ہے۔ گویا صحرائے عرب کا بادیہ پیما

---

[۱] مقالاتِ اسلم، مرتبہ امداد صابری صفحہ ۲۲

یکایک شیراز میں گلگشتِ مصلّیٰ اور سیرِ رکنا باد کو نکل پڑتا ہے۔ حافظ شیراز جیسا زندہ دل پیرمایہ میزبان پاکر وہ پے بہ پے جام لنڈھانا چاہتا ہے، دوست احباب اس کی زبان سے نعرۂ "لبیک" سننے کے منتظر ہیں مگر اب اس کے منہ سے "ہات الصبوح" کا شور سن کر ملامت پر آمادہ ہیں، فارسی شاعری کا یہ شیدائی، کلام حافظ پر سر دھننے والا، اس کی زندگی، حالات اور کارناموں پر روشنی ڈالتا ہے اور اس کے اشعار کی خوبیوں، اثرات اور مقبولیت کے اسباب بیان کرکے سرمستی اور اثر آفرینی کے وہ پہلو روشن کرتا ہے جو صدیوں سے ہدفِ ملامت تھے۔ حافظ کی شاعری سے مسحور مولانا ایک جگہ لکھتے ہیں:

"سعدیؔ فارسی زبان کا پیغمبر ہے، اسلوبِ زبان کا بادشاہ ہے، اس کی گلستاں کی نثر کے ایک ایک فقرے دوسرے شعرا کے ایک ایک دیوان پر بھاری ہیں، لیکن دیکھیے معنوی خوبیوں میں، لفظوں کی شیرینی اور فصاحت میں، طرز ادا اور اسلوبِ بیان کی جدت اور لطافت میں حافظ کس قدر اس سے بلند ہے"[1]

مولانا کلام حافظ کے اس قدر دلدادہ ہیں کہ فارسی شاعری کے منتخب اشعار پر دیوان حافظ کے بیشتر اشعار کو فوقیت دیتے ہیں، چنانچہ اسی ضمن میں ایک دوسری جگہ اس طرح لکھتے ہیں:

"فارسی کی تمام شاعری کا اگر انتخاب کیا جائے تو اچھے اور عمدہ اشعار اتنے نہ نکل سکیں گے جتنے صرف دیوان حافظ میں نکلیں گے۔ دیوانِ حافظ کے تمام اشعار بے مثل اور لاجواب ہیں"[2]

خواجہ حافظ کے کلام کا یہ شیدائی فال نکالنے کی رسم کو بدعت سمجھنے کے باوجود حافظ کے کلام سے ہی فال نکالتا ہے اور اپنے اس غیر شرعی فعل پر کسی پچھتاوے کے بغیر اس کا جواز تلاش کرتا ہوا یہ لکھتا ہے:

"ایسا نفیس کلام جس سے ہر مذہب و ملت کے برگزیدہ لوگ روحانی سرور حاصل کریں، اکابر مشائخ اور صوفیائے کرام اس کو آبِ حیات سمجھیں، شاعر اور ادیب اس پر جان دیں، اگر سادہ لوحوں پر اس سے اچھا اثر پڑے تو کیا اس کلام کی وقعت میں کچھ فرق آسکتا ہے"[3]

حافظ کے کلام سے انتہائی درجہ کی شیفتگی مولانا کے امتیازی مسلک کی نشاندہی کرتی ہے اور اس

---

[1] حیاتِ حافظ، فیضِ عام، علی گڑھ، ۱۹۳۳ء، صفحہ ۱۰۰ [2] ایضاً صفحہ ۱۰۱ [3] ایضاً صفحہ ۲۷

معاملہ میں ڈاکٹر اقبال کے تمام تر احترام اور ان کے کلام کے بہترین مداح ہونے کے باوجود مولانا نے اقبال کے حافظ پر معترض ہونے اور ان کے اس موقف سے شدید اختلاف کیا۔ انھوں نے مثنوی اسرارِ خودی میں علامہ اقبال کی حافظ کے مقابلہ میں عرفی کو بہتر اور بہتر بنانے کی روش پر اعتراض کیا اور کہا کہ خود عرفی کی خودی اقبال کی اصطلاحی خودی کے مقابلہ میں بے معنی اور بے حیثیت ہے۔" عقیدت مندی نے خواجہ حافظ کے کلام پر بھی تقدس کا ایک غلاف چڑھا دیا ہے۔ عرفی کا کلام تو اس سے بھی عاری ہے۔ رہیں ادبی خوبیاں تو ان کے لحاظ سے عرفی خود اسی شمع کا پروانہ ہے۔"[۵]

گردِ مرقدِ حافظ کہ کعبۂ سخن است   در آمدیم بعزمِ طواف در پرواز

مولانا اسلم نے اقبال کی مثنوی اسرارِ خودی کے وہ اشعار لکھ دیے اور اس کے بعد حافظ کے کلام کو ان معائب سے انتہائی خوبصورتی کے ساتھ پاک بتلاتے ہوئے، اس شاعرانہ روایت اور ذہنیت کی مذمت کی جسے قرآن شریف نے مذموم قرار دیا ہے:

"حقیقت یہ ہے کہ ہماری شاعری خود رحجاں ہے، تر علیمی نہیں ہے، اس کے چند مخصوص عقیدات ہیں جن کو واقعیت سے کوئی سروکار نہیں ہے، انھیں کو شعرا الفاظ کے نئے نئے لباس میں پیش کرتے ہیں۔ یہ زندگی کے لیے کسی عملی شاہراہ کی طرف ہدایت کرتی ہے نہ سوا ادبی لطافت کے کوئی خاص مقصد پیش نظر رکھتی ہے۔ قرآن شریف نے جس شاعری کو مذموم قرار دیا ہے اس کا یہ بہترین یا بدترین نمونہ ہے۔"[۶]

یہاں علامہ اقبال کے وہ اشعار بھی پڑھ لینا ضروری ہے جن میں عرفی کو حافظ پر فوقیت دی گئی ہے اور جنھیں مندرجہ بالا اقتباس کے ذریعہ مولانا نے کالعدم قرار دینا چاہا ہے۔ اشعار یوں ہیں[۷]:

حافظ جادو بیاں شیرازی است   عرفی آتش زباں شیرازی است

این سوی ملک خودی مرکب جہاند   وآن کنارِ آب رکن آباد ماند

این فتیل ہمت مردانہ   آن ز رمز زندگی بیگانہ

بادہ زن با عرفی ہنگامہ خیز   زندہ از صحبت حافظ گریز

---

[۵] حیات حافظ، فیض عام، علی گڑھ ۱۳۳۹ھ، صفحہ ۸۲۔ [۶] حیات حافظ صفحہ ۱۱۲ [۷] مقالات اسلم صفحہ ۸۱

اقبال سے اس واضح اختلاف کے باوجود مولانا کو ان کے کلام، شعری مقاصد موضوعات اور خصوصاً ان کے کلام کی اثر آفرینی تسلیم تھی۔ وہ دنیائے شعر کی لطافتوں کے آشنا اور اس کے ذہنی اور وجدانی اثر کے قدردان تھے۔ ان کی فارسی شاعری کے اسلامی پیغام اور شعری حسن اور اس فن کے قدردان ہی نہیں بلکہ فدائی بھی تھے، چنانچہ انھوں نے اسرار خودی (۱۹۱۹) پیام مشرق (۱۹۲۳) اور جاوید نامہ (۱۹۳۲) کا غائر مطالعہ ہی نہیں کیا بلکہ کلام کی افادیت اور اثر آفرینی کی داد بھی دی ہے۔ انھوں نے ان شعری مجموعوں میں غالباً خود اپنے مجتہدانہ مسلک اور عقیدہ کی ترجمانی پائی اور اسی لئے شاید ان کے قلم سے اقبال کی شاعرانہ عظمت سے متعلق بڑے عظیم الشان جملے لکھے گئے۔

"ہم سنا کرتے تھے کہ فارسی زبان سیکھنے کے بعد صرف چار کتابیں اچھی پڑھنے کو ملتی ہیں۔ شاہنامہ فردوسی، مثنوی مولانا روم، گلستان سعدی اور دیوان حافظ۔ مگر جاوید نامہ کو پانچویں کتاب سمجھنی چاہئے جو کہ معنویت اور نافعیت کے لحاظ سے ان سب سے اچھی ہے حقیقت میں یہ اس قابل ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانان عالم کے نصاب میں شامل کر لی جائے"[۸]

مولانا اسلم کا ذہن بہت صاف تھا۔ وہ حافظ پر اقبال کی نکتہ چینی سے ملول تھے لیکن اقبال کی زبان سے رسائی ملا کی کج فہمی اور کٹھ ملائیت پر بھرپور طعن و تشنیع سے خوش بھی ہیں۔ وہ اقبال کے حضور سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کو دائرۂ الوہیت میں داخل کر دینے پر آزردہ ہیں لیکن جب اقبال قرآن مبین کی ابدیت اور آفاقیت کا ذکر اپنے اشعار میں کرتے ہیں تو بے اختیار وہ ان اشعار کا ورد کرنے لگتے ہیں۔[۹]

نقش قرآں تا دریں عالم نشست	نقشہائے کاہن و پاپا شکست
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است	ایں کتابی نیست چیزی دیگر است
مثل حق پیدا و ہم پیدا است ایں	زندہ و پایندہ و گویاست ایں

اقبال کے مذہبی اعتقادات، عالم اسلام کی بیداری کے تصورات اور قرآن کی برتر حقیقت کے شاعرانہ اظہار میں مولانا کے اپنے افکار و عقیدہ کا دخل تو تھا ہی لیکن اس میں فارسی شاعری کی طبعی شیرینی اور اثر پذیری کو بھی سراہنا چاہئے جو مولانا اسلم کے شاعر مشرق کی حیات ہی میں ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو لاہور میں

---

[۸] مقالات اسلم، صفحہ ۸۰ [۹] ایضاً صفحہ ۱۳۔

منائے جانے والے یوم اقبال کی تقریبات میں زندہ اور پائندہ نذرانہ عقیدت پیش کرنے کا سبب بنا:

"ڈاکٹر اقبال کے الفاظ ایسی دلکش امیدوں سے اس قدر بھرے ہوئے اور اسلامی حقائق سے اتنے لبریز ہیں کہ میں ان کو اسلام کا سب سے بڑا شاعر ماننے پر مجبور ہوں۔ اس انتہائی زوال اور پستی کے زمانے میں مسلمانانِ ہند کے لئے ان کا کلام قدرت کی طرف سے ایک موہبت کبریٰ ہے جس نے ہمارے نوجوانوں کی جدید دماغی تعمیر میں بڑا حصہ لیا ہے اور آئندہ کے لئے وہ ہمارا نہ صرف ادبی بلکہ ملی سرمایہ ہے۔"[100]

مولانا مرحوم نے لکھا ہے کہ حیات جامی (۱۹۰۹) حیات حافظ سے زیادہ ہاتھوں ہاتھ لی گئی لیکن یہ محض اظہار واقعہ تھا ورنہ جامی اور حافظ کی شعری حیثیت میں خاصا فرق ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ اہمیت اُن کے نظامی گنجوی کی مخزن الاسرار والے مضمون کی ہے۔ حافظ اور جامی کی شخصیات اور ان کا کلام تو مولانا کے مذاق سے فطری مناسبت رکھتا تھا، لیکن مخزن الاسرار" پڑھیے تو مولانا کے تحقیقی شعور اور صفات شاعری پران کی دقیق نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثنوی کی تاریخ، مثنوی نگار شعراء اور ان کی مثنویاں، پھر نظامی کی خمسہ، ان پر شرحیں تضمینیں، جوابی مثنویاں، ادبی معرکے، امیر خسرو اور مولانا جامی کی شہرہ آفاق مثنویوں کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے آخر میں اپنے دو محبوب مثنوی نگار یعنی نظامی گنجوی اور امیر خسرو دہلوی کے کلام پر ناقدانہ محققانہ، ایمان دارانہ اور غیر جانب دارانہ رائے، ان کی صلاحیتوں کا عالمانہ ثبوت ہیں۔ مولانا مرحوم نظامی اور خسرو دونوں کو پسند کرتے ہیں اور دونوں کو داد سخن دیتے ہوئے خود اس واقعہ کو نظم کر دیتے ہیں جو خسرو کے ساتھ اُس وقت پیش آیا جب خمسہ نظامی کا جواب لکھتے ہوئے ایک غیبی تلوار نے ان پر وار کیا اور اسی کے ساتھ ایک غیبی ہاتھ (حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا ہاتھ) نے اُس وار کو روکا۔ چار بندوں کی اس نظم میں سے دو بند نمونہ کے طور پر پیش ہیں، جن سے ایک طرف مولانا اسلم مرحوم کی دونوں سے غایت درجہ کی دلچسپی اور عقیدت کا اظہار ہوتا ہے اور ساتھ ہی ان کی سخن سنجی اور سخن گوئی، برجستگی اور قادر الکلامی کا اندازہ بھی:[101]

اسلم شیدائے طراز سخن — خیز و ببیں جلوۂ نازِ سخن
بیں کہ چہ حوریست بیارا ستہ — جاں پئے قدر قدمش باختہ

---

[100] نوادرات، ادارہ مطبوعات اسلام کراچی ۱۹۵۱ء صفحہ ۱۲۹ [101] نوادرات صفحہ ۱۰۴

نور رخش بین که بزیر نقاب		روشنیش خیره کند آفتاب
مطلع الانوار که نامش بود		چشمهٔ خورشید بجامش بود
معنی او در تهٔ حرف سیه		چون بشب تار مه بیار ده
روشنیش زنگ زدای دلست		نی که پی گلخن و آب و گل است
مطلع الانوار خدائیست این		شیوهٔ اعجاز نمائیست این

پادشہ نظم و نظامیست بس		خام بود از دگران این ہوس
لیک کسانیکہ درین تنگنائی		گام نہادند بفرہنگ درائی
خسرو از آنجملہ درین داوری		برد فضیلت بزبان آوری
گرچہ نہ ہم سنگ نظامیست او		لیک بہ از فیضی و جامیست او
مطلع الانوار نہ آیات اوست		معجزہ گر نیست، کرامات اوست
یافت زسر از قلم خسروی		قاعدۂ نظم نظامی نوی
بر قلمش باد ہزاران درود		از من و از جملۂ یاراں درود[۱۲]

مطلع الانوار کو اعجاز نمائی کا طرز، نظامی کو نظم کا بادشاہ، خسرو کی داوری اور فیضی اور جامی پر ان کی برتری اور نظامی کی طرز کو خسرو کی بدولت نیا نظم پانا، ان سب کو مولانا نے کس قدر شیریں زبان، رواں انداز اور خوبصورت الفاظ میں منظوم کر دیا ہے کہ بے ساختہ سنائی کے حدیقۃ الحقیقۃ کے اس معروف شعر کی بحر یاد آجاتی ہے :

اے کہ شنیدی صفت روم و چین		خیز و بیا ملک سنائی ببیں

شعرگوئی اور برجستہ گوئی کا یہ انداز مولانا کو ایک کہنہ مشق شاعر کا درجہ دینے کے لئے کافی ہے۔
جس شخص نے فردوسی، خیام، نظامی، خواجو، سلمان، کمال خجند، رومی، سعدی، وحشی، خاقانی، حافظ، خسرو، جامی، عرفی، بیدل اور اقبال کے دواوین اور کلیات کا گہرا مطالعہ کیا ہو، وہ بھلا شعر کیوں

---

[۱۲] نوادرات صفحہ ۱۰۴

نہ کہنا! قصیدہ، مثنوی اور غزل جیسی مقبول عام اصناف شاعری کا دلدادہ کیوں نہ ہوتا! چنانچہ مولانا کے یہاں آورد کے بجائے آمد پر زیادہ توجہ تھی، جب کبھی ان کے دل نے کسی واقعہ کا اثر قبول کیا وہ بے تکلف نظم کر گئے۔ اپنی کتاب سیرت عمرو بن عاص میں ایک جگہ جب قبطی امیر عبداللہ کے بلا وجہ کوڑا مارے جانے کا واقعہ لکھتے ہیں تو "تربیت حریت" کے عنوان سے تین بندوں میں اسے کیسے سادہ اور مؤثر انداز میں منظوم کرتے ہیں۔ ایک بند ملاحظہ ہو:

قبطی پیش عمر نالید زار — کای امیر عادل گردون وقار
هر دو در جولانگهی می تاختیم — اسپهای خویش باهم تاختیم
گفت جوئی سربلندی ای لئیم — برعرب ابن الکریم ابن الکریم
بهر بالابستہ ای ای نیک نام — حرمت ذمیست بر مسلم حرام[۱۳۳]

مولانا شاعر تھے مگر فارسی شاعری کے رجحانات ہمہ گیری نے ان کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ مفسر قرآن، عالم دین اور مورخ تاریخ اسلام ہونے کے باوجود ان میں تقشف نہ تھا۔ انھوں نے مثنوی لکھی، غزل کے اسرار و رموز بیان کئے اور عجمی شاعری میں تصوف کے اثرات کے الزام کا نہ صرف دفاع کیا بلکہ اس کو سراہا اور پر زور الفاظ میں یہ بات کہی:

"عجمی شاعری نے اول اول حسن و عشق کے گہوارے اور سلاطین و امراء کی مداحی کے آغوش میں پرورش پائی۔ کچھ زمانہ کے بعد صوفیانہ خیالات کے بزرگوں نے اس پہ تصوف کا رنگ چڑھایا، خاص کر مولانائے روم نے اس صور کو اس بلند آہنگی سے پھونکا کہ شاعری نے حریم دین میں بار پا لیا یہاں تک کہ آج بھی مسجدوں کے منبروں پر سے ان کی آواز بازگشت سنائی دیتی ہے۔"[۱۳۴]

ایک محتاط عالم، دانش مند محقق اور سلجھا ہوا نقاد اور فارسی شاعری کا دلدادہ فارسی شاعری کو اس سے بڑھ کر اور کون سا خراج پیش کر سکتا تھا! وہ غزل سرائی پر آمادہ نہ ہوئے۔ باقاعدہ شاعری کا سودا سر میں نہیں سمایا ورنہ جو شخص قصیدہ میں خاقانی کی ہمسری کا دعویٰ کرتا ہو اور صنعت قصیدہ کے

---

۱۳۳ سیرت عمرو بن عاص، مطبع جامعہ ملیہ، علی گڑھ، ۱۳۴۴ھ/۱۹۲۵ء، صفحہ ۱۷، ۱۳۴ نوادرات صفحہ ۹۴

معروف لوازمات، تشبیب، مدح، گریز، حسنِ طلب اور دعا کے اشعار کو پوری شان و شوکت سے بیان کر سکتا ہو، وہ یہ پیشہ کیوں نہیں اختیار کر سکتا تھا۔ والیٔ بھوپال کے حضور میں ایک عریضہ کے چند اشعار مولانا کی پُرگوئی کا روشن ثبوت ہیں:

حضرتِ نوابِ سلطانِ جہاں گردوں وقار — آنکہ با صد حشمت و شوکت نگہبانی کند

نیتِ پاکش چو صافی ترز آبِ گوہر است — در ہمہ کارش مدد تائیدِ یزدانی کند

مدح مقصد نیست اینجا ندعائے دیگر است — ورنہ اسلم ہم تواند آنچہ خاقانی کند

آفتابِ دولت و اقبال تو تابندہ باد — خطۂ بھوپال را عدلِ تو نورانی کند

بہرحال مولانا نے اگر اپنے اس شوق کو مہمیز لگائی ہوتی تو کیا عجب کہ اپنے ہم وطن علامہ شبلیؒ، حمید الدین فراہی اور مولانا اقبال احمد سہیل کی مانند وہ بھی کوئی شعری مجموعہ بطور یادگار چھوڑ جاتے اور اردو نظموں کے مجموعوں کے علاوہ فارسی کا مجموعۂ کلام بھی شاملِ فہرستِ تصانیف "اسلم شیدائی طرازِ سخن" ہوتا۔

خواجہ حافظ شیرازی

"ہمارے سامنے اس وقت ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے تمام بڑے بڑے شعراء کے دیوان رکھے ہوئے ہیں، جب ہم ان کو پڑھتے ہیں اور پھر خواجہؒ کے دیوان کو اٹھا کر دیکھتے ہیں، تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ حقیقت میں کپتان کلارک کا یہ کہنا نہایت صحیح ہے کہ: "خواجہ ایک ایسے شاعر ہیں، جن کا موازنہ دنیا کے کسی شاعر کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا"

(حیاتِ حافظ صفحہ ۱۳) مولانا اسلم جیراجپوری

سعید انصاری

مولانا اسلم جیراجپوری
اور
جامعہ ملیّہ اسلامیہ

جامعہ کے اُن اساتذہ اور طلبا میں جو ۱۹۲۰ء کی عدم تعاون اور خلافت کی تحریک میں ایم اے او کالج چھوڑ کر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں آئے، ان میں سے بہت تھوڑے ایسے تھے جنھیں جامعہ ملیہ کے اغراض و مقاصد سے حقیقی دل چسپی رہی ہو، وہ بانیانِ جامعہ سے دلی تعلق اور محبت رکھتے ہوں اور انھوں نے جامعہ کا آخر تک ساتھ دیا ہو، مولانا اسلم جیراجپوری ان چند میں سے ایک تھے۔

انھیں مدرسۃ العلوم کے در و دیوار کچھ محبوب نہ تھے اور نہ وہ ایم۔ اے۔ او کالج کی قدیم روایات کے شیدا کہ وہ مسلم یونیورسٹی ہی میں رہنا پسند کرتے یا واپس ہوگئے ہوتے، بلکہ مولانا اسلم کا ذہن ایسا حسّاس اور فعّال تھا کہ جب کوئی نئی تحریک اٹھتی یا کوئی نیا فکر اور خیال سامنے آتا، مولانا اسلم اسے دیکھتے، پرکھتے اور اس پر بے تکلف اپنے خیالات کا اظہار کرتے اور اگر اس میں انھیں ایمان کی روشنی دکھائی دیتی اور حق کی آواز سنائی دیتی تو وہ اسے بلا خوفِ لومۃ لائم قبول کر لیتے۔ عدم تعاون اور خلافت کی تحریک پر لبیک کہنا ان کے اسی جذبۂ ایمانی اور حق پسندی کا نتیجہ تھا۔

مولانا کی اسی زمانہ کی ایک ولولہ انگیز نظم کا ایک شعر ہے:

دہر میں مسلم ہے حق کی آزمائش کے لیے
تمغۂ ایماں نہیں ملتا نمائش کے لیے

پھر اس کے بعد بھی جب جب کوئی نئی علمی اور دینی تحریک اٹھی یا کسی نئے مصنف یا

بڑے شاعر کا کلام شائع ہوا، مولانا کا قلم سب سے پہلے جنبش میں آتا اور قدم سب سے آگے ہوتا۔

اس سے کچھ عرصہ بعد جب سعودیوں نے شریفی فوجوں کو شکست دینے کے بعد کہ جن کے پیچھے برطانوی طاقت بھی تھی، پورے حجاز پر قبضہ کرلیا اور پورے مقامات مقدسہ کو ان کے ناپاک قدموں سے پاک کرایا تو مولانا اسلم ان چند لوگوں میں تھے جنھوں نے اس مبارک تحریک کا خیر مقدم کیا۔ اسی طرح خاکسار تحریک کے بانی علامہ مشرقی نے ایک معرکۃ الآرا کتاب تذکرہ کے نام سے لکھی، جن سے بہت سے لوگوں کو اختلاف تھا۔ مولانا نے اس کا بھی استقبال کیا۔ پھر علامہ اقبال کے کلام کا سلسلہ شروع ہوا جو روایتی عقائد و خیالات سے اتفاق نہیں رکھتے تھے، مولانا نے ان میں سے اکثر پر ریویو لکھا اور نہ صرف ان کی تائید کی، بلکہ کہیں کہیں ان سے اختلاف بھی کیا۔

۱۹۲۰ء میں جب جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڈھ میں قائم ہوئی، اس وقت مولانا محمد علی جو نہ صرف جامعہ کے بانیوں میں تھے بلکہ اس ادارے کے اصل روح رواں تھے، انھوں نے ان نو وارد طلبا کے لئے جو علی گڑھ کالج چھوڑ کر یا ہندوستان کے دوسرے اداروں سے بغرض تعلیم یہاں آئے تھے۔ اسلام کے بنیادی اصول اور عقائد کی تعلیم کے ساتھ ساتھ، ان کے دلوں کو تاریخ اسلام کے کارناموں سے گرمانے کا ایک پروگرام بنایا تاکہ وہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں اس نئی تحریک کے اچھے مبلغ اور مجاہد بن کر پھیل جائیں۔

خود تو انھوں نے اپنے لئے اقبال کی تازہ تصنیف 'مثنوی اسرار خودی' کو اپنا موضوع بنایا تھا۔ مولانا اپنی تقریر میں جس کیف اور بیخودی کے ساتھ اس کے اشعار پڑھتے، بے ساختہ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں شروع ہو جاتیں، خود روتے اور دوسروں کو رلاتے بھی جاتے۔

لیکن یہ تنہا کافی نہ تھا۔ انھوں نے ہندوستان کے بعض مقتدر علماء اور اپنے موضوع کے ممتاز اساتذہ کو بھی جامعہ آنے کی دعوت دی اور ان کے ذریعہ توسیعی خطبات کا ایک سلسلہ شروع کیا جس سے تمام طلباء فائدہ اٹھا سکیں۔ ان خطبات کا سب سے پہلا سلسلہ مولانا حمید الدین فراہی سے شروع ہوا جو نہ صرف 'نظم قرآن' کے بہت بڑے ترجمان بلکہ درس قرآن میں بھی خاص امتیاز رکھتے تھے۔ انھوں نے مولانا محمد علی کی اس درخواست پر سورۂ فاتحہ کی تفسیر شروع کی اور اس پر ایک ہفتہ تک خطبہ دیا۔ افسوس ہے کہ ان لکچروں کا نہ تو

مولانا نے ہی کوئی مسودہ چھوڑا اور نہ طلبا کے ہاتھ کے کوئی نوٹ یا یادداشت مل سکی ورنہ مولانا کے علمی متروکات میں یہ ایک بیش بہا تصنیف ہوتی اور جامعہ کی مطبوعات اور تالیف میں ایک قابلِ یادگار اضافہ۔

اسی طرح دوسرے توسیعی خطبات کا سلسلہ تاریخ اسلام پر شروع کیا جس کے لئے دار المصنفین، اعظم گڈھ کے ایک نوعمر رفیق مولوی سعید انصاری کو مدعو کیا جو اتفاق سے راقم الحروف کے ہمنام تھے۔ مولوی صاحب نے اس میں شبہ نہیں کہ بڑی محنت و کاوش کے ساتھ اپنے خطبات تیار کئے، لیکن نہ جانے طلبا اور سامعین پر اس کا کیا اثر ہوا، مولوی صاحب خود جامعہ کے ماحول سے اس قدر متاثر ہوئے کہ یہیں قیام پر مائل ہو گئے مگر اس خیال سے کہ مبادا دونوں اداروں کے تعلقات پر ناگوار اثر نہ پڑے، پھر دار المصنفین واپس جانے پر راضی ہو گئے۔

مولانا اسلم ۱۹۰۶ء میں جب علی گڑھ تشریف لائے تو سب سے پہلے ایم۔ اے۔ او کالج، علی گڈھ کے ہائی اسکول میں فارسی اور عربی کے استاد مقرر ہوئے، اس کے بعد کالج میں ....
..... وہ انہی مضمونوں کے پروفیسر ہو گئے۔ لیکن ۱۹۲۲ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کے بعد وہ مولانا محمد علی کے اصرار پر جامعہ میں آ گئے، اور تاریخ اسلام کا مضمون جس کے مولانا محمد علی اس قدر دلدادہ تھے۔ باقاعدہ درس کے لئے ان کے سپرد ہوا۔ مولانا نے تاریخ اسلام کا کچھ سلسلہ اگرچہ جامعہ آنے سے قبل شروع کیا تھا، جیسا کہ انھوں نے اپنے انتہائی سوانح حالات میں لکھا ہے لیکن اس کی تکمیل اور اشاعت جامعہ میں آنے کے بعد ہوئی اور پورا سلسلہ کل آٹھ جلدوں میں 'تاریخ الامت' کے نام سے مکتبہ جامعہ ملیہ سے شائع ہوا۔ پہلے سات حصوں میں تو مولانا نے ابتدائے اسلام سے لے کر مصطفیٰ کمال اتاترک کے الغائے خلافت تک کی تاریخ بیان کی ہے اور پھر آٹھویں حصہ میں قرآن کی روشنی میں ملت کے زوال و انحطاط کے اسباب سے بحث کی ہے اور اس کی اصلاح کی صورتیں پیش کی ہیں۔ تاریخ اسلام پر اس سے زیادہ مرتب اور مکمل تصنیف اُس وقت تک اردو میں نہیں لکھی گئی تھی۔

مولانا محمد علی کی مولانا اسلم کے جامعہ میں لانے کی ایک بڑی غایت یہ بھی تھی کہ وہ جامعہ میں دینی تعلیم کے جدید اصولوں اور نئی بنیادوں پر انتظام کرنا چاہتے تھے۔ مولانا اسلم کی تعلیم اگرچہ

تمام تر قدیم طرز پر ہوئی تھی لیکن مولانا خود کسی قدیم درس گاہ کے فارغ شدہ نہ تھے، بلکہ ان کی تعلیم زیادہ تر ان کے والد بزرگوار مولوی سلامت اللہ صاحب کے ہاتھوں ہوئی تھی جو اس وقت کی جماعت اہل حدیث کے ایک بہت سرگرم رکن تھے اور اس وجہ سے انھیں نواب صدیق حسن خاں نے بھوپال بلالیا تھا جو اس وقت مسلمانوں کی دینی اور تہذیبی زندگی کا مرکز بن گیا تھا۔ اس حیثیت سے مولانا کو نہ صرف ایک اچھا ماحول ملا بلکہ بعض اچھے اساتذہ کے تلمذ کا شرف بھی حاصل ہوا۔ اس اعتبار سے مولانا کی نظر نہ صرف علوم اسلامی بلکہ اس کے درس و تدریس پر بھی بہت اچھی تھی۔ ان کا ذہن قدیم عربی مدارس کی تعلیم اور نصاب کے متعلق بہت صاف تھا اور وہ انھیں جدید حالات کی روشنی میں اور زندگی کے نئے تقاضوں کے نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہتے تھے۔ اپنے ابتدائی زندگی کے سوانح حالات میں ایک جگہ وہ اصول فقہ کے متعلق بطور لطیفہ لکھتے ہیں کہ "ایک بار قاضی شیخ محمد جعفری نے مجھ سے پوچھا کہ تم کیا پڑھ رہے ہو؟" میں نے کہا کہ "شرح وقایہ"۔ پھر پوچھا کہ حدیث کی بھی کوئی کتاب پڑھی ہے یا نہیں؟ کہنے لگے کہ تمھارے والد بہت دانشمند ہیں۔ وہ پہلے تاریکی کی سیر کراتے ہیں تاکہ روشنی کی قدر معلوم ہو سکے[1]۔"

آگے وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں: "حدیث کے سوا باقی علوم میں خواہ وہ عقلی ہوں یا نقلی، جو کتابیں درس میں رکھی گئی ہیں، وہ تقریباً تمام کی تمام شرحیں ہیں، جس میں نہ صرف غیر ضروری بلکہ غیر متعلق اور لاطائل بحثیں بھری ہوئی ہیں۔ میں سوچتا تھا کہ خود متون .... کیوں نہیں پڑھائے جاتے اور ان شروح کی تعلیم میں کیوں فضول وقت ضائع کیا جاتا ہے مگر جب ان متون پر غور کیا تو اس قدر مغلق نظر آئے کہ پڑھانے کے قابل نہیں معلوم ہوتے۔"

اس سے آگے چل کر وہ مزید لکھتے ہیں کہ "نہ صرف عقاید و اصول فقہ بلکہ منطق و فلسفہ و ہیأۃ وغیرہ میں بھی جو غیر شرعی علوم ہیں، قدامت کے تقدس کا ایک غلاف چڑھا دیا گیا ہے اور جو کچھ کتابوں میں لکھا جا چکا ہے، اساتذہ

---

[1] مقالاتِ اسلم، مرتبہ مولانا اسلم جیراجپوری، ناشر امداد صابری، چوڑی والان، دہلی۔ صفحہ ۱۸

کی نگاہوں میں آخری الفاظ بلکہ مسلمات ہیں[1]۔"

مولانا قدیم نصاب تعلیم میں سرے سے کلی انقلاب چاہتے تھے۔ اور جدید درس گاہوں میں اس وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ کا وجود خاص اہمیت رکھتا تھا، یہاں طلبا کو عربی زبان پختہ طور پر پڑھاکر خالص قرآن وسنت یعنی عمل بالقرآن کی تعلیم دینا مقصود تھا، اور بس۔ اس کے بعد ان کو زندہ دنیاوی علوم سکھانے کا پروگرام تھا تاکہ وہ روزی پیدا کرسکیں اور دین کو دنیا کمانے اور ملت میں تفرقہ ڈالنے کا ذریعہ نہ بنائیں۔

مولانا اسلم جس زمانے میں جامعہ ملیہ میں تھے، بعض لوگ جامعہ کے اندر اور باہر ان کے عقاید وخیالات پر نکتہ چیں رہا کرتے تھے۔ کبھی وہ منکر حدیث سمجھے جاتے تو کبھی اہل قرآن بتائے جاتے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ مولانا کا علوم دینی کا مطالعہ نہ صرف ان کے علم و واقفیت تک محدود تھا بلکہ بعض بعض خیالات اور مسائل میں انھوں نے ریسرچ اور تحقیق سے بھی کام لیا تھا۔ ایک بار فقہ کی ایک مشہور کتاب سراجی کا ذکر آیا جو طلبا کے زیر مطالعہ تھی۔ لکھتے ہیں کہ جب سراجی میں حجب کا مسئلہ آیا اور معلوم ہوا کہ ایک صاحب جو فقہ کے طالب علم تھے، محجوب الارث ہو تو فرماتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہ "ان سے زیادہ مجھے اس کا قلق ہوا۔ میرا دل مطلقاً اس کو قبول نہیں کرسکا کہ یہ اسلام کی تعلیم ہوسکتی ہے کہ یتیم پوتا جملہ خاندانی ملکیت سے محروم کر دیا جائے لیکن میں نے جس قدر اس کی تحقیق کی، اسی قدر اس پر نہ صرف مذاہب اربعہ بلکہ جملہ ائمہ حدیث اور علمائے سلف کو متفق پایا اور ساری اسلامی تاریخ میں ایک شخص بھی ایسا نہ ملا جس نے اس کی مخالفت کی ہو، مگر دل میں خلش برابر باقی رہی۔ الحمد للہ کہ قرآن کریم نے رہنمائی کی اور سورج کی طرح واضح کر دیا کہ یہ مسئلہ صحیح نہیں ہے۔ میں نے سالہا سال تک بہت سے اہل علم سے زبانی گفتگو کی اور جو اہل فتویٰ ہیں ان سے تحریری مناظرے کیے مگر کسی کے پاس میری دلیلوں کے جواب نہ نکلے۔ اس وقت رسالہ محجوب الارث لکھ کر شائع کیا جس میں ثابت کیا کہ قرآن وحدیث تو خیر خود فقہ کی رو سے بھی یتیم اولاد

---

[1] ایضاً صفحات ۲۲ تا ۲۴

محبوب نہیں ہو سکتی۔"[1]

مولانا کے ان اجتہادات اور خیالات کی بنا پر بعض لوگ یہ سمجھتے تھے کہ مولانا عقیدتاً اہلِ قرآن ہیں اور اس جماعت کے امام سے ان کا گہرا تعلق ہے۔ کبھی کبھی مولانا آزاد جامعہ کی کسی تقریب میں تشریف لاتے اور مولانا اسلم انھیں مل جاتے تو مزاحاً فرماتے کہ "مولانا، نمازیں تو آپ کے نزدیک تین ہی ہوں گی"، لیکن مولانا ایک زیرِ لب تبسم کے ساتھ اسے سنتے اور ٹال جاتے۔ مولانا نے خود کبھی ان باتوں کا جواب نہیں دیا، البتہ ان کے ابتدائی سوانح حالات سے اس سلسلے میں ان کے مسلک کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

مولانا ایک زمانے میں ہمیں حدیث بھی پڑھایا کرتے تھے اور جامعہ کے درجہ ابتدائی کے نصاب میں بلوغ المرام کے نام سے ایک حدیث کی کتاب داخلِ نصاب تھی۔ اس کے پڑھاتے وقت میں نے دیکھا کہ مولانا نے کبھی بھی حدیث کا جو دینی درجہ اور احترام ہونا چاہیئے، اس کا دامن ہاتھ سے چھوڑا ہو، یا وہ کبھی حدیث کے لفظی اور معنوی ہونے کی بحث میں الجھے ہوں اور نہ ہی کبھی وہ اس فرق کی طرف مائل ہوتے۔

یہی حال ان کے درسِ قرآن کا بھی تھا۔ بعض زمانوں میں درسِ قرآن کا گھنٹہ بھی ان کے سپرد کر دیا جاتا تھا اور ہمارے نصاب میں ڈھائی پارے کی پوری سورۃ البقرہ داخل تھی۔ اگرچہ تفسیرِ قرآن کے لئے ایک علیحدہ استاد مولانا خواجہ عبدالحیٔ صاحب مامور تھے، لیکن خواجہ صاحب کی تفسیر کچھ ایسی سیاسیاتِ حاضرہ سے متاثر ہوتی کہ وہ ہمارے حلق سے نیچے نہیں اترتی تھی اور اسی سورۃ بقرہ کی تفسیر "خلافتِ کبریٰ" کے نام سے کتابی صورت میں آج بھی کتب خانوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کے مقابلہ مولانا اسلم کے طریقہ تدریس میں آیات کا سیدھا سادہ ترجمہ ہوتا اور جامعہ میں عربی چونکہ لازم تھی طلباء میں اتنی استعداد ہو جاتی کہ قرآن پاک کا ترجمہ بآسانی سمجھ میں آجاتا۔ مولانا بھی اپنے فکر اور مطالعہ کی بنیاد پر آیتوں کی مزید وضاحت اگر ضرورت ہوتی! دوسری آیتوں سے بے تکلف کر دیا کرتے تھے، جس میں ان کا حفظِ قرآن بہت

۱۔ ایضاً۔ صفحات ۱۸۔۱۹

کام آتا تھا۔

ایک بار چودھری غلام احمد پرویز جنھوں نے اپنا تصنیفی نام 'رازی' رکھ چھوڑا تھا، مولانا سے ملنے آئے، اور وہ اکثر نئی دہلی سکریٹریٹ سے فارغ ہوکر اپنے بعض مسائل جو قرآن فہمی سے متعلق ہوتے، حل کرنے کے لئے آجایا کرتے تھے۔ اتفاق سے ایک مسئلہ جو انھوں نے پیش کیا تقسیم وراثت سے متعلق تھا۔ مولانا نے اسے سنتے ہی فوراً اس طرح حل کردیا کہ پرویز صاحب نہ صرف مطمئن ہو گئے بلکہ حیرت سے پوچھنے لگے کہ یہ خیال کہیں اور دیکھنے میں نہیں آیا، اس پر مولانا نے ایک افتخار کے لہجے میں فرمایا کہ یہ خاکسار کی زندگی بھر کی کوششوں کا نتیجہ ہے اور پھر یہی خیال مولانا نے مزید ترتیب و اضافہ کے ساتھ الوراثۃ فی الاسلام کے نام سے ایک رسالہ کی صورت میں شائع کیا، جس کی اشاعت کا سہرا بھی مولانا کی دوسری کتابوں کی طرح مکتبہ جامعہ ہی کو حاصل ہے۔

مولانا نہ صرف اپنے دینی عقائد و خیالات میں کتاب و سنّت کے قائل تھے بلکہ حد درجہ مذہبی اور دینی مزاج رکھتے تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی کے حالات سے ان کے دینی اعتقادات اور مذہبی رجحانات کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔

"اللہ تعالیٰ نے بندوں کی انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی ہدایت اور ان کی عقلوں کو صحیح راستے پر لگانے اور اپنی رضامندی کے اعمال کو واضح کرنے کے لئے ایک ناقابل تغیر و تبدل کتاب اور مکمل دستور قرآن کریم کو اتارا تاکہ اس کے مطابق عمل کرکے لوگ اس کی خالص بندگی کی سعادت حاصل کریں اور دنیا جہاں کی غلامی سے آزاد ہو جائیں۔"

محمد اسلم جیراجپوری

(جامعہ، اپریل ۱۹۳۸ء، صفحہ ۳۴۳)

عبداللطیف اعظمی

مولانا اسلم کی اقبال شناسی

مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری مرحوم، برصغیر ہند و پاک کے ممتاز اقبال شناسوں میں سے تھے اور جامعہ کے ان چند بزرگ اساتذہ میں سے جن کو علامہ اقبال سے بہت زیادہ خلوص و محبت اور گہری عقیدت تھی، مولانا نے علامہ کی چار کتابوں: "مثنوی اسرار خودی" (مطبوعہ: ۱۹۱۵ء)، "پیام مشرق" (۱۹۲۳ء)، "جاوید نامہ" (۱۹۳۲ء) اور "ضرب کلیم" (۱۹۳۶ء) کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے، اول الذکر تین کتابیں فارسی میں ہیں اور چونکہ مولانا کا فارسی زبان کا مذاق بہت ستھرا اور فارسی ادب کا مطالعہ بہت گہرا تھا، اس لیے ان کتابوں پر ان کا تبصرہ بڑا قابل قدر ہے اور ان مضامین کی اقبالیات میں بڑی اہمیت ہے، چوتھی کتاب اردو میں ہے اور اس پر مولانا کا مضمون نسبتاً مختصر ہے مگر اس کے باوجود اس سے مولانا کے وسعتِ علم اور قوتِ تنقید کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ ان مضامین کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ علامہ اقبال کی زندگی میں لکھے گئے اور ان کی نظر سے گذرے تھے۔ پیش نظر مضمون میں مولانا کے ان چاروں مضامین کا تعارف اور خلاصہ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے:

مثنوی اسرار خودی

علامہ اقبال کا یہ پہلا مجموعۂ کلام ہے جو ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا اور چونکہ اس کے دیباچے میں مروجہ تصوف پر اعتراضات کئے گئے تھے اور کچھ اشعار میں خواجہ حافظ پر تنقید کی گئی تھی، اس لیے ایک خاص حلقے میں اقبال کے خلاف ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا جس کی وجہ سے دوسرے اڈیشن میں دیباچہ اور وہ اشعار جن میں خواجہ حافظ پر اعتراضات کئے گئے تھے، حذف کردئے گئے

اس پورے عرصے میں مولانا خاموش تماشائی بنے رہے اور اس سلسلے میں کچھ نہیں لکھا، تقریباً چار سال کے بعد ۱۹۱۹ء میں یہ مہرِ سکوت ٹوٹی اور اس کتاب کے بارے میں ایک بھرپور مضمون لکھا جو مئی ۱۹۱۹ء کے ماہنامہ "الناظر" (لکھنؤ) میں شائع ہوا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مولانا اتنے طویل عرصے تک خاموش کیوں رہے؟ اور جب اقبال نے قابل اعتراض حصہ کتاب سے خارج کر دیا اور مخالفت ختم ہو گئی تو اس وقت مضمون لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ ان سوالات کا جواب خود مولانا کے الفاظ میں ملاحظہ ہو، وہ لکھتے ہیں: "میں ایک عرصے سے اس بحث کو دیکھ رہا تھا لیکن اس وجہ سے خاموش تھا کہ یہ اصولی بحث نہ تھی۔ چند روز ہوئے میرے پاس مثنوی "راز حقیقی" ایک دوست کے ذریعے سے پہنچی جو خان بہادر پیرزادہ مظفر احمد صاحب متخلص بہ فضلی پنشنر ڈپٹی کلکٹر محکمۂ انہار پنجاب نے "اسرار خودی" کے جواب میں لکھ کر شائع کی ہے۔ بعض دوستوں نے اصرار کیا کہ میں کچھ ضرور ان مثنویوں پر لکھوں، اس لیے مجبوراً مہرِ سکوت کو توڑنا پڑا، لیکن میرے اس لکھنے کا منشا صرف یہ ہے کہ اس بحث کو اصل مرکز پر لاؤں تاکہ آئندہ موافقین یا مخالفین جو کچھ لکھیں وہ قوم کے لیے مفید ہو، ذاتیات سے کوئی فائدہ مرتب نہیں ہوتا۔" (نوادرات صفحہ ۷۷)

مولانا نے اپنے اس مضمون میں اگرچہ علامہ اقبال کو یہ مشورہ دیا ہے کہ: "ڈاکٹر صاحب نے اس مثنوی میں خواجہ حافظ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اگر وہ نہ لکھتے تو بہتر تھا، کیونکہ اس کی وجہ سے ایک تو خود ان کی ذات پر حملے ہونے لگے اس لئے کہ قدیم اصول ہے:

بزرگش نخوانند اہلِ خرد — کہ نامِ بزرگاں بزشتی برد

دوسرے نفسِ مسئلہ جو مفید تھا ان ناگوار بحثوں کے حجاب میں آ گیا" (صفحہ ۷۸) لیکن ساتھ ہی علامہ اقبال کے اعتراض کی تائید بھی کی ہے، فرماتے ہیں: "خواجہ حافظ کے کلام کے متعلق اس قسم کی رائیں پہلے سے بھی لوگوں کی چلی آتی ہیں، ڈاکٹر صاحب کچھ اس کے اول مجرم نہیں ہیں، چنانچہ مشہور ہے کہ بادشاہ عالمگیر نے عام منادی کرادی تھی کہ دیوانِ حافظ کوئی نہ پڑھے، کیونکہ لوگ اس کے ظاہری معنی سمجھ کر گمراہ ہوتے ہیں" (صفحہ ۷۹) اس کے بعد علامہ کی حمایت و تائید میں "حیاتِ سعدی" سے مولانا حالی کے دو اقتباسات، ایک طویل اور دوسرا مختصر نقل کیے ہیں، طویل اقتباس حسب ذیل ہے:

"خواجہ حافظ کی غزل مجالس اور محافل میں سب سے زیادہ گائی جاتی ہے اور اس کے مضامین سے اکثر لوگ واقف ہیں، وہ ہمیشہ سامعین کو چند باتوں کی ترغیب دیتی ہے: عشقِ حقیقی کے ساتھ عشقِ مجازی اور صورت پرستی و کام جوئی کو بھی دین و دنیا کی نعمتوں سے افضل بتاتی ہے۔ مال و دولت، علم و ہنر، نماز و روزہ، حج و زکوٰۃ، زہد و تقویٰ، غرضکہ کسی شئے کو نظر بازی اور شاہد پرستی کے برابر نہیں ٹھیراتی، وہ عقل و تدبیر، مآل اندیشی، تمکین و وقار، ننگ و ناموس، جاہ و منصب وغیرہ کی ہمیشہ مذمت کرتی ہے اور آزادگی، رسوائی، بدنامی وغیرہ کو جو عشق کی بدولت حاصل ہو، تمام حالتوں سے بہتر ظاہر کرتی ہے۔ دولتِ دنیا پر لات مارنا، عقل و تدبیر سے کام نہ لینا، توکل و قناعت کے نشے میں اپنی ہستی مٹا دینا اور جوہرِ انسانیت کو خاک میں ملا دینا، دنیا و ما فیہا کے زوال و فنا کا ہر وقت تصور باندھے رکھنا، علم و حکمت کو لغو و پوچ اور حجابِ اکبر جاننا، حقائقِ اشیاء میں کبھی غور و فکر نہ کرنا، کفایت شعاری اور انتظام کا ہمیشہ دشمن رہنا جو کچھ ہاتھ لگے اس کو فوراً کھو دینا اور اسی طرح کی بہت سی باتیں اس سے مستفاد ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام مضامین ایسے ہیں جو بے فکروں اور نوجوانوں کو بالطبع مرغوب ہوتے ہیں اور کلام کا سادہ اور عام فہم ہونا اور شاعر کی فصاحت و بلاغت اور مطرب و رقاصہ کی خوش آوازی اور حسن و جمال اور مزامیر کی لے اُن کو لے اُڑتی ہے اور ان کی تاثیر کو دس بیس گنا کر دیتی ہے اور جب باوجود ان سب باتوں کے سامعین کو یہ اعتقاد بھی ہو کہ اس کلام کے قائل اکابر، صوفیاء اور مشائخ کرام ہیں جن کی تمام عمر حقائق اور معارف کے بیان کرنے میں گزری ہے اور جن کا شعر شریعت کا رہنما اور عالمِ لاہوت کی آواز ہے تو یہ مضامین زیادہ دل نشیں ہو جاتے ہیں۔" (صفحہ ۸۶)

تصوف کے سلسلے میں علامہ اقبال کی حمایت کرتے ہوئے، مولانا لکھتے ہیں: "اصل مرکزِ بحث یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب یہ کہتے ہیں کہ مذہبِ اسلام ایک حقیقی پیغامِ عمل ہے، باوجود پیروِ اسلام ہونے کے موجودہ مسلمانوں میں جو جمود ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان پر ایک بیرونی عنصر مذہبی رنگ میں آ کر غالب ہو گیا ہے اور وہ تصوف ہے، اسی تصوف کے مسئلۂ فنا اور نفس کشی نے

مسلمانوں کی قوت عمل کو باطل کر دیا ہے، کیونکہ تصوف کا اثر تمام ادبیات اسلامیہ میں ساری ہو گیا ہے اور ہر قوم کے ادبیات کا ایک تدریجی اثر اس قوم کے جذبات اور قوائے نفسانیہ پر ہوتا ہے، اس لیے رفتہ رفتہ اس کے اثر سے ہماری قوت عمل جاتی رہی۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں مسئلہ نفی خودی کو بنی نوع انسان کی مغلوب قوموں نے ایجاد کیا ہے کہ اس تعلیم سے مخفی طور پر غالب قوموں کو کمزور بنائیں۔" (صفحہ ۸۶) اس اقتباس میں ایک جگہ لفظ "نفس کشی" آیا ہے، اس پر حاشیے میں لکھا ہے: "تصوف نفس کشی سکھلاتا ہے لیکن اسلام کی یہ تعلیم نہیں ہے، وہ صرف اصلاحِ نفس کا خواہاں ہے۔"

اسلامی تصوف کے آغاز وارتقاء پر بحث کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے: "سرچشمۂ اسلام یعنی قرآن وحدیث تصوف کے لفظ تک سے ناآشنا ہیں۔ یہ لفظ دوسری صدی ہجری میں عربی زبان میں داخل ہوا۔ مستشرقین یورپ و دیگر محققین جن میں سے کوئی کہتا ہے کہ تصوف فلسفۂ اشراق سے لیا گیا ہے، کوئی اس کا ماخذ کلیساؤں کی رہبانیت کو قرار دیتا ہے.... تاریخ اسلام بھی ہمارے سامنے ہے، اس سے جہاں تک معلوم ہوتا ہے، یہ ہے کہ ابتدا ابتدا میں جو اہلِ زہد تارک الدنیا اور گوشہ گیر ہو کر عبادت اور ریاضت میں مصروف رہتے تھے، ان کو لوگ صوفی کے نام سے پکارنے لگے..... اس زمانے میں تصوف اخلاص کا نام تھا جس کو حدیث شریف میں "احسان" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، یہی وہ تصوف ہے جس کی مدح غزالیؒ وغیرہ ائمۂ اسلام نے لکھی ہے، لیکن جب تاتاریوں کے حملے شروع ہوئے اور چنگیز اور ہلاکو نے ایک قیامتِ صغریٰ برپا کر دی تو ان کی ہولناک خونریزیوں سے امت کے فاتحانہ جذبات مٹ گئے، دنیا کی طرف سے ان کے دل سرد ہو گئے۔ طبیعتوں کا جوش اور ولولہ جاتا رہا، حوصلے پست اور ہمتیں سست ہو گئیں، زوال ونفاد کے نقشے آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ میلانِ خاطر زہد اور ترکِ دنیا کی طرف بڑھ گیا اور سرمایۂ توکل وقناعت کو لیکر گوشۂ عافیت میں بیٹھنا پسند آیا۔ عالمِ فانی کے جاہ وجلال کی وقعت نگاہوں میں نہ رہی، بوریائے فقر سریرِ سلطنت سے زیادہ عزیز سمجھا گیا، کلاہِ نمدی کو تاجِ زر پر ترجیح دی گئی.... ذوقِ عمل طبائع سے یہاں تک مسلوب ہو گیا کہ "شیوۂ قلندری" کے مقابلے میں "رہ ورسمِ پارسائی دور و دراز" نظر آنے لگی، عالمِ ذوق میں حلقۂ یاران میں

"خلوت در انجمن" ہونے لگی اور سجادے ہی پر "سفر در وطن" کی کڑی منزلیں طے کی جانے لگیں، شریعت اور حقیقت دو جداگانہ راستے قرار پائے اور ان میں پوست اور مغز کی تفریق کی گئی، علمارد فقہا محجوب و بے بصر سمجھے گئے۔ یہ اثرات اگر صرف ایک ہی جماعت تک محدود ہوتے تو نقصان نہ ہوتا لیکن شاعری کے ساز پر یہ ترانہ کچھ اس انداز سے چھیڑا گیا کہ تمام ملک اس صدا سے گونج اٹھا اور ادبیاتِ اسلامیہ میں ایک قسم کے جمود اور رہبانیت کا اثر ساری ہوگیا۔" (صفحہ ۹۰)

مولانا کا یہ مضمون علامہ اقبال کی نظر سے گذرا تو انھوں نے فوراً ہی مولانا کو خط لکھا جس میں ان کے تبصرے کا شکریہ ادا کیا اور حافظ پر تنقید کرنے اور دیباچے کو خارج کرنے کے اسباب پر روشنی ڈالی۔ مکمل خط ملاحظہ ہو :

لاہور۔ ۱۷ مئی ۱۹۱۹ء

مخدومی، السلام علیکم

آپ کا تبصرہ اسرار خودی پر "الناظر" میں دیکھا ہے جس کے لیے میں آپ کا نہایت شکر گذار ہوں :

"دیدمت مردے دریں قحط الرجال"

خواجہ حافظ پر جو اشعار میں نے لکھے تھے، ان کا مقصد محض ایک لٹریری اصول کی تشریح اور توضیح تھا۔ خواجہ کی پرائیوٹ شخصیت یا ان کے معتقدات سے سروکار نہ تھا مگر عوام اس باریک امتیاز کو سمجھ نہ سکے اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس پر بڑی لے دے ہوئی۔ اگر لٹریری اصول یہ ہو کہ حُسن حُسن ہے خواہ اس کے نتائج مفید ہوں خواہ مضر تو خواجہ دنیا کے بہترین شعراء میں سے ہیں۔ بہرحال وہ اشعار میں نے حذف کر دئے ہیں اور ان کی جگہ اسی لٹریری اصول کی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے جس کو میں صحیح سمجھتا ہوں۔ عرفی کے اشارے سے محض اس کے بعض اشعار

کی طرف تلمیح مقصود تھی[1]، مثلاً

گر نتم آنکہ بہشتم دہند بے طاعت
قبول کردن صدقہ نہ شرط انصاف است

لیکن اس مقابلے سے میں خود مطمئن نہ تھا اور یہ ایک مزید وجہ ان اشعار کو حذف کر دینے کی تھی۔ دیباچہ بہت مختصر تھا اور اپنے اختصار کی وجہ سے غلط فہمی کا باعث تھا، جیسا کہ مجھے بعض احباب کے خطوط سے اور دیگر تحریروں سے معلوم ہوا جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں۔ کیمبرج کے پروفیسر نکلسن بھی اس خیال میں آپ کے ہم نوا ہیں کہ دیباچہ دوسرے ایڈیشن سے حذف نہ کرنا چاہیے تھا۔ انھوں نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کر دیا ہے، شاید انگریزی ایڈیشن کے ساتھ شائع کریں۔

پیرزادہ مظفر الدین صاحب نے میرا مقصد مطلق نہیں سمجھا۔ تصوف سے اگر اخلاص فی العمل مراد ہے (اور یہی مفہوم قرونِ اولیٰ میں اس کا لیا جاتا تھا) تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا، ہاں جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظامِ عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔ میں نے ایک تاریخ

---

[1] مولانا نے حافظ اور عرفی کا مقابلہ کر کے عرفی کو ترجیح دی تھی، اس پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے مولانا نے اقبال سے اختلاف کیا تھا اور حافظ کو چھوڑ کر عرفی کو مقتدا بنا لینا بعینہٖ اس مثل کے مصداق ہے: "فرمن المطر و وقع تحت المیزاب۔" [بارش سے بھاگ کر پرنالے کے نیچے کھڑا ہو گیا] (صفحہ ۸۱) مولانا نے مزید لکھا تھا: "عقیدت مندی نے خواجہ حافظ کے کلام پر پھر بھی تقدس کا ایک غلاف چڑھا دیا ہے، عرفی کا کلام تو اس سے بھی عاری ہے۔" (صفحہ ۸۲)

تصوف کی لکھنی شروع کی تھی مگر افسوس کہ مسالہ نہ مل سکا اور ایک دو باب لکھ کر رہ گیا۔ پروفیسر نکلسن "اسلامی شاعری اور تصوف" کے نام سے ایک کتاب لکھ رہے ہیں جو عنقریب شائع ہوگی، ممکن ہے کہ یہ کتاب ایک حد تک وہی کام کر دے جو میں کرنا چاہتا تھا۔ منصور حلاج کا رسالہ کتاب الطواسین جس کا ذکر ابن حزم کی "فہرست" میں ہے، فرانس میں شائع ہوگیا ہے، مولف نے فرنچ زبان میں نہایت مفید حواشی اس پر لکھے ہیں، آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ حسین کے اصلی معتقدات پر اس رسالے سے بڑی روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے مسلمان منصور کی سزا دہی میں بالکل حق بجانب تھے۔ اس کے علاوہ ابن حزم نے کتاب الملل میں جو کچھ منصور کے متعلق لکھا ہے اس کی اس رسالے سے پوری تائید ہوتی ہے، لطف یہ ہے کہ غیر صوفیا سب کے سب منصور سے بیزار تھے، معلوم نہیں متاخرین اس کے اس قدر دلدادہ کیوں ہوگئے۔ مذہب آفتاب پرستی کے متعلق جو تحقیقات حال میں ہو رہی ہے اس سے امید ہوتی ہے کہ عجمی تصوف کے پوشیدہ مراسم کی اصلیت بہت جلد دنیا کو معلوم ہو جائے گی۔

مجھے امید ہے کہ اس طویل خط کے لئے آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔ آپ کے تبصرے سے مجھے بڑی تسکینِ قلب ہوئی۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

والسلام[۵]

آپ کا مخلص

محمد اقبال

چند سال ہوئے، اکتوبر ۱۹۷۷ء میں کشمیر یونیورسٹی (سری نگر) میں اقبال چیئر کے اہتمام میں "اقبال اور تصوف" کے عنوان سے ایک سیمینار ہوا تھا جس میں ملک کے مشہور ادیبوں اور دانشوروں

---

[۵] محمد اقبال : اقبال نامہ (حصہ اول) صفحات ۵۲ - ۵۵

نے مقالے پڑھے تھے جو اب کتابی صورت میں شائع ہوگئے ہیں۔ ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان فاضل مقالہ نگاروں کی نظر سے مولانا محمد اسلم جیراجپوری مرحوم کا یہ مفصل تبصرہ نہیں گذرا تھا، ورنہ ان مقالوں میں جو خامیاں نظر آتی ہیں اور خیالات میں جو انتشار محسوس ہوتا ہے، وہ شاید نہ ہوتا۔

پیامِ مشرق

۱۹۲۳ء کے وسط میں "پیام مشرق" شائع ہوئی تو مولانا نے فوراً ہی اس پر مضمون لکھا جو ستمبر ۱۹۲۳ء کے ماہنامہ "جامعہ" (علی گڑھ) میں شائع ہوا۔ مولانا نے اس مضمون میں اقبال کی فارسی دانی کی بیحد تعریف کی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں: "ڈاکٹر صاحب نے جب فارسی زبان میں شعر گوئی اختیار کی تو شروع میں ان کی بعض مثنویوں کی زبان پر لوگوں نے اعتراضات کئے لیکن اب انھوں نے اپنے ذہنِ وقّاد اور طبعِ نقاد سے زبان میں ایسی لطافت اور شستگی پیدا کرلی ہے کہ صائب اور نظیری کے رنگ میں آگئے۔ اس تمام مجموعے میں زبان کی صفائی اور پختگی اور کلام کی بے ساختگی اور برجستگی پر کہیں مشکل سے انگلی رکھی جاسکتی ہے۔" (نوادرات صفحہ ۹۳)

کتاب کے مقصد اور موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے: "عجمی شاعری نے اوّل اوّل حسن و عشق کے گہوارے اور سلاطین و امراء کی مداحی کے آغوش میں پرورش پائی۔ کچھ زمانے کے بعد صوفیانہ خیالات کے بزرگوں نے اس پر تصوف کا رنگ چڑھایا، خاص کر مولانائے روم نے اس صور کو اس بلند آہنگی سے پھونکا کہ شاعری نے حریم دین میں بار پالیا، یہاں تک کہ آج بھی مسجدوں کے منبروں سے اس کی آوازہ بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اب زمانے نے دوسری کروٹ بدلی اور امت اسلامیہ غیروں کے پنجۂ تسلط میں پڑ کر مصائب و آلام میں مبتلا ہوگئی۔ اسی وجہ سے شاعری نے بھی نیا رنگ اختیار کیا اور اس کے ساز پر قومی اور وطنی راگ گائے جانے لگے۔ مصر، ایران، ہندوستان نیز افغانستان ہر جگہ شاعری سے یہ کام لیا جانے لگا۔ ہم ان تمام نغموں کو سنتے ہیں لیکن ان سب میں ڈاکٹر صاحب کی لَے ایک جداگانہ انداز رکھتی ہے، وہ دو باتوں میں خصوصیت کے ساتھ ممتاز نظر آتی ہے:

"(۱) قومی شعراء کی نگاہیں اپنی قومی اور ملکی حدود سے باہر کم پہنچتی ہیں اور ڈاکٹر صاحب کے پیشِ نظر
، امتِ اسلامیہ ہے، یعنی ان کا خطاب صرف جذبۂ اسلامی سے ہے نہ کہ ایرانی یا تورانی سے ،
ں لیے اوروں کے کلام کو ہم صرف "قومیات" یا "وطنیات" کہہ سکتے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کی
لمیں "ملیات" کے لقب کی مستحق ہیں ۔

(۲) دوسرے شعراء جذباتِ عام کو لے کر تکلم کا لباس پہناتے ہیں، بخلاف اس کے
اکٹر صاحب کی طبعِ خداداد حیاتِ ملیہ کے اسرار از خود اخذ کر کے ان کو شاعری کے قالب
، ڈھالتی ہے۔" (صفحہ ۱۰۳)

مولانا مزید وضاحت فرماتے ہوئے لکھتے ہیں: "عجمی شاعری جس نے تصوف کی خدمت
اری کی اس میں اور ڈاکٹر صاحب کی شاعری میں بھی بڑا فرق ہے، وہ فنا اور نفس کشی کی تلقین
تی ہے اور یہ خودی اور زندگی کی، وہ تند مزاجوں کو برف بناتی ہے اور یہ افسردہ دلوں کو برق ہے"
فحہ ۱۰۴) آگے چل کر علامہ کی شاعری کی امتیازی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا فرماتے
، : "ڈاکٹر صاحب کی شاعری کا اصلی سرچشمہ قرآنِ عظیم ہے، اسی کے رموز کو لیکر وہ اس ساز پر نغمہ سرائی
تے ہیں: وہ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ دینِ اسلام ہر قسم کی انسانی صلاح وفلاح پر حاوی اور دینی و
یوی ترقیات کا کفیل ہے، ایک غزل میں کہتے ہیں:

تو رہ شناس نۂ وز مقام بے خبری — چہ نغمہ ایست کہ در بربطِ سلیمیٰ نیست

، دوسری غزل میں کہا ہے:

برکش آں نغمہ کہ سرمایۂ آب و گل تست — اے ز خود رفتہ تہی شو ز نوائے دگراں

بی تہذیب جو بدبختی سے مسلمانوں کی نگاہوں کو خیرہ کئے ہوئے ہے، ان کے نزدیک نہایت نا استوار
ر پر قائم ہے اور وہ ایک طمع کاری ہے جس کی تہہ میں انسانیت اور ہمدردی کا نام ونشان نہیں ہے ،
تے ہیں:

فرنگ گرچہ سخن با ستارہ می گوید — حذر کہ شیوۂ او رنگ جوں زنی دارد

ابش گرمیِ یک آہ بیتابانہ نیست — رندا ایں میخانہ را یک لغزشِ مستانہ نیست

مسلمانوں پر مدت ہائے دراز سے عجمی ادبیات نے اثر ڈال کر ان میں افسردگی پیدا کر رکھی ہے، اس سے بھی سخت بیزار ہیں اور پھر ان کو اصل عربی اسلامی رنگ میں لانا چاہتے ہیں، کہتے ہیں:

دگر بدشت عرب خیمہ زن کہ بزمِ عجم　　مئے گزشتہ و جامے شکستنی دارد"

(صفحات ۱۰۶ و ۱۰۷)

ڈاکٹر اقبال مرحوم نے بعض اشعار میں ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے جن سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ جمہوریت کے مخالف ہیں، کچھ ایسا ہی مولانا اسلم صاحب نے بھی محسوس کیا، وہ لکھتے ہیں: "ڈاکٹر صاحب کا سارا کلام دیکھنے سے یہ صاف نمایاں ہوتا ہے کہ ان کا آب و گل حریت اور مساوات اور خمیر جمہوریت کا ہے، لیکن ان کا یہ قول:

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کاری شو　　کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید

نہایت تعجب انگیز ہے، اس لیے کہ اگر وہ "پختہ کار" صاحب بھی "خرِ نا مشخص" نکلے تو پھر کیا ہوگا، کیونکہ یہ کون کہہ سکتا ہے کہ ملائکہ کا جو استاد ہے وہی راندۂ درگاہ اور ملعونِ بارگاہ ہوگا، وہ غریب خود اس سے بے خبر تھا، چنانچہ کہتا ہے:

بر لوح ثبت بود کہ ملعون شود یکے　　بردم گماں بہر کس و بر خود گماں نبود

اس میں کچھ شک نہیں کہ رائے صواب ہر معاملے میں صرف ایک ہی ہوتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ ایک شخص سے حاصل کی جائے یا ایک جماعت سے، مشورے میں دو فائدے ہیں: (۱) نتیجہ خراب ہونے کی صورت میں ملامت کا خوف نہیں رہتا، اسی بنیاد پر رسول اکرمؐ کو بھی جن کی رائے کے قطعی درست ہونے میں شبہ نہیں تھا: "شاورھم فی الامر" کا حکم دیا گیا۔ (۲) بہ نسبت ایک شخص کے جماعت میں اغلباً مذاق صحیح موجود ہوتا ہے، اس لیے عام مسلمانوں کے لیے: "امرھم شوریٰ بینھم" نازل ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کی رائے کی کوئی توجیہہ میری سمجھ میں بجز اس کے نہیں آتی کہ میں اس کو ان کی تعلیمات سے نکال کر مطائبات میں شمار کر لوں۔" (صفحہ ۱۰۹) اس پیرے کے ختم پر حاشیہ ہے کہ: "غالباً ڈاکٹر صاحب کا مقصد ڈکٹیٹر شپ ہے لیکن وہ بھی بادشاہت سے کم نقصان رساں نہیں ہے۔"

مضمون کے آخر میں "خاتمہ" کے عنوان سے علامہ کی شاعری کی خصوصیات پر تقریباً پون صفحہ

جو کچھ لکھا ہے اس کا پہلا پیرا ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں: "ڈاکٹر صاحب کا کلام اگرچہ تمام آورد ہے لیکن اس میں انتہائی لطافت اور انتہائی ایجاز ہے یعنی فصاحتِ لفظی اور بلاغتِ معنوی دونوں کی پوری پوری رعایت ملحوظ ہے، جو مضمون ہے وہ نہایت صاف، برجستہ اور نکتہ سنجی اور ندرتِ خیال کا پسندیدہ ترین نمونہ ہے۔ اندازِ بیان اور طرزِ ادا انوکھا اور دلکش ہے، ان کی توجہ خیالات کی رفعت اور معنی کی بلندی کی طرف زیادہ رہتی ہے، صنائع و بدائع اور تشبیہات و استعارات کے پیچھے وہ نہیں پڑتے لیکن باوجود اس کے لفظوں کی لطافت اور ترکیبوں کی نزاکت کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔" (صفحہ ۱۱۰)

جاوید نامہ

"جاوید نامہ" ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تو "پیامِ مشرق" کی طرح اس پر بھی مولانا نے فوراً ہی مضمون لکھا جو اسی سال یعنی ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون کا آغاز اس طرح ہوتا ہے: "ان دنوں ڈاکٹر اقبال کی جدید تصنیف "جاوید نامہ" کے مطالعہ کا اتفاق ہوا، ان کی دیگر تصنیفات کی طرح یہ کتاب بھی دماغی لذت اور روحانی کیف کے لیے ایک لطیف نعمت ہے، بلکہ اس میں ایک جدت یہ ہے کہ شاعر نے پیرِ رومی کے ساتھ افلاک کی سیر کی ہے، مختلف سیاروں میں ارواح اور ملائکہ سے ملاقات ہوئی جن کے ساتھ حقائق اور عہدِ حاضر کے اہم مسائل پر سوالات اور جوابات ہوئے۔" (صفحہ ۱۱۱) تمام افلاک کی سیر کا خلاصہ بیان کرنے کے بعد مولانا نے اشتراکیت پر تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے اور اشتراکیت کے بنیادی مقاصد اور اس کی تعلیمات پر روشنی ڈالنے کے ساتھ اسلام کے بنیادی مقاصد اور اس کی تعلیمات پر بحث کی ہے اور دونوں کے اشتراک اور فرق کو بیان کیا ہے۔ یہ بحث خاصی دلچسپ اور علمی ہے، اس کے مطالعہ سے بہت سے لوگوں کی معلومات میں اضافہ نہ ہوگا اور جو لوگ دونوں میں فرق نہیں کرتے، ان کی غلط فہمیاں یا ناواقفیت یقیناً اس کے مطالعے سے دور ہو جائے گی۔ مگر افسوس کہ اس مضمون میں اس بحث کو چھیڑنے کے لئے گنجائش نہیں، اس لیے معذرت خواہ ہوں، البتہ قرآن اور روس کے سلسلے میں مولانا نے کچھ دلچسپ باتیں لکھی ہیں، انھیں ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

"قرآن ہر زمانے کے لیے ہدایت ہے اور ہر ماحول میں وہ نیا عالم پیدا کرتا ہے۔ مسلمانوں نے اصولی غلطی یہ کی کہ قرآن کی اُن شرحوں اور تاویلوں کو جو مخصوص اوقات اور حالات میں ہوتی رہی ہیں، دائم و قائم سمجھ لیا، جس کے باعث قرآن متروک و مہجور ہو گیا، حالانکہ آج ان انسانی تفاسیر کا بڑا حصہ قطعاً بیکار بلکہ مُردہ ہو چکا ہے اور قرآن اسی طرح زندہ اور سرچشمۂ ہدایت ہے، وہ ہر زمانے میں ایک نئی تفسیر کا طلبگار ہے۔

"ایک صاحب نے جو قرآن کا عمیق علم رکھتے ہیں اور کسی زمانے میں روس کے اعلیٰ سیاسی طبقے سے روشناس رہے ہیں، مجھ سے مکہ معظمہ میں بیان کیا کہ انھوں نے مسٹر لینن اور ان کے رفقائے کار سے کہا کہ تم نے جو شکست و ریخت کی ہے، وہ عین اسلام کے مطابق ہے، اس نے کہا کہ مسلمان علماء تو ایسا نہیں کہتے۔ انھوں نے کہا کہ کسی کے کہنے یا نہ کہنے کی کیا بات ہے۔ روسی زبان میں قرآن کا ترجمہ موجود ہے، میں آیات خود تم کو دکھلا دیتا ہوں۔ جب اس نے دیکھ لیا تو کہا کہ تعجب ہے کہ مسلمان کیوں ہمارے خلاف ہیں۔ انھوں نے کہا کہ لادینی کی وجہ سے، جہاں تم نے باطل شکنی کی ہے، اگر حق کا بھی اقرار کر لو تو پھر تم سے بڑھ کر کوئی مسلمان نہیں، کیونکہ اسلام کا پیغام صرف یہ ہے کہ: "باہم بھائی بھائی بن جاؤ اور اکیلے اللہ کے بندے بنے رہو۔" (صفحہ ۱۱۶)

اس کے بعد مولانا نے یہ بلیغ جملہ لکھا ہے: "مگر ابھی وہاں [روس میں] نفی کا بحران ہے، اثبات تک پہنچنے میں نہ معلوم کتنا زمانہ لگے۔"

ضربِ کلیم

"ضربِ کلیم" ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی اور مولانا نے اس کتاب کے بارے میں جو مضمون لکھا ہے، اس پر سنہ اشاعت ۱۹۳۷ء درج ہے، اس کے معنی ہیں کہ یہ مضمون فوراً نہیں لکھا گیا، اس کے علاوہ، گذشتہ تینوں مضامین کے مقابلے میں بہت ہی مختصر ہے یعنی کل ۲½ صفحے کا، اگر اس مضمون کے بہت طویل ہو جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو پورا مضمون یہاں نقل کیا جا سکتا تھا، لہٰذا صرف ایک اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے، مولانا لکھتے ہیں:

"بالِ جبریل [مطبوعہ ۱۹۳۵ء] کے بعد ڈاکٹر اقبال کے تازہ اردو کلام کا مجموعہ "ضرب کلیم" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ یہ کس قدر دلکش اور روح پرور ہے، صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، ان اشعار کی تعریف کرنا یا دوسرے شعراء کے کلام کی طرح ان کی داد دینا، یا اپنے خیال کے ساتھ ان کی مطابقت دکھانا یا بے کیف توضیحات کرکے ان کی لطافت کو کھونا نہ صرف کور ذوقی ہے بلکہ شریعت ادب میں گناہِ کبیرہ ہے، کیونکہ یہ شاعری نہیں ہے بلکہ حیات ملیہ اسلامیہ کے ان اہم مسائل کے متعلق جن میں مفکرین غلطاں و پیچاں ہیں اور جو دفتر کے دفتر سیاہ کرنے سے بھی حل نہیں ہوتے، دو دو اور چار چار شعروں میں بچی اور تلی رائیں، روشن تعلیمات اور بے پردہ حقائق ہیں جو اہل بصیرت کی نگاہوں میں موتی کی طرح پڑی چمک رہی ہیں، ان کی کیفیت بقول مرزا بیدل یہ ہے:

نزاکتہاست در تصویر مینا خانۂ حیرت
مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگ تماشا را

ان کو تو بس دیکھئے، سوچئے اور نہاں خانۂ دل کے کسی گوشہ میں محفوظ رکھ لیجئے۔"

(نوادرات صفحہ ۱۲۲)

علامہ اقبال سے اختلاف

مولانا اسلم مرحوم علامہ اقبال کی بیحد عزت کرتے ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ محبت اور عقیدت میں کسی اقبال شناس سے کم نہیں ہیں، مگر ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو کسی سے عقیدت رکھتے ہیں تو اس کی ہر بات کو بغیر چون و چرا کے مان لیتے ہیں۔ مولانا اپنے دل و دماغ کو کھلا اور آزاد رکھتے ہیں اور جن مسائل میں وہ اپنی ذاتی رائے رکھتے ہیں ان میں محض جوشِ عقیدت اور فرطِ محبت میں مداہنت سے کام لینے کو مناسب اور جائز نہیں سمجھتے۔ "ضرب کلیم" کے مختصر تبصرے میں ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے: "چونکہ میرا طریقۂ فکر جداگانہ ہے، اس لیئے ڈاکٹر صاحب کی بعض باتوں سے کلی طور پر میں متفق نہیں ہو سکا۔" (صفحہ ۱۲۲) جیسا کہ گذشتہ صفحات میں ہم لکھ چکے ہیں کہ مولانا کا فارسی کا ذوق بہت اچھا تھا اور فارسی ادب پر ان کی غائر نظر تھی، اس لیے بعض الفاظ کے استعمال پر انھوں

خلاف کیا اور علامہ اقبال نے ان کے اعتراض کے وزن کو تسلیم کیا۔ تفصیل ملاحظہ ہو:

"پیامِ مشرق" پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا نے دو اعتراضات کئے ہیں: ایک لفظ "تپید" کے استعمال پر دوسرے "آہے گذاشت است" کی ترکیب کو مکروہ قرار دیا۔ جن اشعار میں یہ دونوں قابل اعتراض چیزیں آئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

حورے بکنج گلشن جنت تپید و گفت — مارا کسے ز آنسوئے گردوں خبر نداد

زاں نازنیں کہ بند زپائش کشادہ اند — آہے گذاشت است کہ بو نام دادہ اند

مولانا فرماتے ہیں: "پہلے مصرع میں "تپید" کا لفظ برمحل نہیں واقع ہوا کیونکہ بے خبری تو وجہ تپش نہیں ہوسکتی اور آخری مصرع میں "آہے گذاشت است" مکروہ معلوم ہوتا ہے، اس مفہوم کو دوسرے لفظ سے ادا کرتے تو بہتر تھا" (ماہنامہ جامعہ۔ ستمبر ۱۹۲۳ء، صفحہ ۱۴۵)

علامہ اقبال نے شاید پہلے اعتراض کو تسلیم کر لیا، لیکن دوسرے اعتراض کے بارے میں ان کو تامل تھا، اس لیے اس کے بارے میں مختلف دانش وروں کی رائیں معلوم کیں۔ ۱۱ر اکتوبر ۱۹۲۳ء کو مولانا عبدالماجد دریا آبادی (۱۸۹۲۔ ۱۹۷۷) کو لکھا: "پیامِ مشرق" میں چند اشعار "بوئے گل" پر ہیں جو آپ کے ملاحظے سے گذرے ہوں گے، آخری شعر ہے:

زندانی کہ بند زپائش کشادہ اند — آہے گذاشت است کہ بو نام دادہ اند

حال میں جامعہ ملیہ علی گڑھ کے رسالے میں "پیامِ مشرق" پر ریویو کرتے ہوئے مولانا محمد اسلم جیراجپوری "آہے گذاشت است" پر اعتراض کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ یہ ترکیب مکروہ معلوم ہوتی ہے، یہی مطلب کسی اور طرح ادا کرنا چاہئے، میں آپ کا خیال معلوم کرنا چاہتا ہوں، مولانا سید سلیمان ندوی سے بھی استصواب کروں گا، چونکہ دوسرا ایڈیشن جلد نکالنے کا ارادہ ہے اس واسطے اگر آپ کا جواب جلد مل جائے تو بہتر ہو۔" (اقبال نامہ (حصہ اول) صفحہ ۲۳۶) ایک ہفتے کے بعد، ۱۸ر اکتوبر ۱۹۲۳ء کو مولانا گرامی کو لکھا: "پیامِ مشرق میں چند اشعار میں نے "بوئے گل" پر لکھے تھے جو آپ کی نظر سے گذرے ہوں گے، ان کا مطلب یہ تھا کہ جنت کی ایک حور دنیا کا نظارہ کرنے کے لیے پھول کی صورت میں نمودار ہوئی اور آخر کار پژمردہ ہوگئی جس کو لوگ نکہتِ گل کہتے ہیں، وہ اس حور کی آہ ہے جس کو اس دنیا میں اپنی یادگار چھوڑا ہے، آخری شعر یہ تھا:

زندانیٔ کہ بند زپایش کشادہ اند آہے گذاشت است کہ بو نام دادہ اند

مولوی اسلم جیراجپوری استاد جامعہ ملیہ علی گڑھ کو یہ اعتراض ہے کہ "گذاشت است" ذوق سلیم کو کھٹکتا ہے، مجھ کو بھی ان کے ایراد میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور معلوم ہوتی ہے لیکن گرامی کا فتویٰ قطعی ہوگا آپ اپنی رائے صحیح سے مطلع فرمائیں۔ اس شعر پر تنقیدی نظر ڈالیے اور نتیجے سے آگاہ کیجیے ۔ مولوی سید سلیمان ندوی[۳] اور عبدالماجد صاحب سے بھی استصواب کیا ہے، بہرحال آپ کی رائے سب پر مقدم ہے، اس شعر کا مطلع ہونا ضروری ہے کہ یہ بنار کا آخری شعر ہے، یوں بھی ہوسکتا ہے :

زاں نازنیں کہ بند زپایش کشادہ اند آہے است یادگار کہ بو نام دادہ اند

(مکاتیب اقبال (بنام گرامی) صفحہ ۲۳۳)

جن لوگوں سے استصواب کیا گیا تھا، معلوم نہیں انھوں نے کیا جوابات دئے مگر میرے سامنے "پیام مشرق" کا چوتھا ایڈیشن (مطبوعہ ۱۹۴۲ء) ہے، اس میں وہ ترمیم شدہ شعر درج ہے جو مولانا گرامی کو لکھا ہے، چونکہ اس شعر میں ترمیم کردی، اس لیے مولانا نے بھی اپنے مجموعۂ مضامین "نوادرات" میں یہ مضمون شامل کرتے وقت تمام اعتراضات خارج کر دئے ہیں اور قابل اعتراض شعر کی جگہ ترمیم شدہ شعر درج کر دیا ہے ۔

"جاوید نامہ" کے تبصرے میں بھی مولانا نے ایک جگہ اعتراض کیا ہے، فرماتے ہیں : "فلک مشتری پر ڈاکٹر صاحب کی ایک ادا قرآن کے خلاف معلوم ہوئی اس لیے اس کو بھی ظاہر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں ۔ وہ جوہر مصطفیٰ کی حقیقت جس کو اللہ تعالیٰ معراج کے بیان میں "عبدہ" فرماتا ہے، حلاج کی زبان میں اس طرح بیان کرتے ہیں :

عبدہ از فہم تو بالا تر ست زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر ست

عبدہ صورت گر تقدیر ہا اندرو ویرانہا تعمیر ہا

عبدہ دہر ست و دہر از عبدہ ست ماہمہ رنگیم او بے رنگ و بوست

---

[۳] "اقبال نامہ" میں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے نام اقبال کے جو خطوط شامل ہیں، ان میں اس طرح کا کوئی خط نہیں ہے، بلکہ ۱۹۲۳ء کا سرے سے کوئی خط ہی نہیں ہے، وجہ جو بھی ہو۔

کس ز سرِّ عبدہ آگاہ نیست   عبدہ جز سرّ الا اللہ نیست

یہاں تک کہ صاف صاف کہتے ہیں:

لاالٰہ تیغ دودم او عبدہ   فاش ترخواہی بگو "ہو عبدہ"

یہ حقیقت میں غلو ہے۔ رسول پاک علیہ وسلم کو انسانیت کے حدود میں رکھنے سے ان کا اسوۂ حسنہ انسانوں کے لیے دلکش اور آسان رہتا ہے، بخلاف اس کے دائرۂ الوہیت میں داخل کردینے سے ان کی پیروی نہ صرف دشوار بلکہ غیر ضروری بھی ہوجاتی ہے، غالبًا اسی نکتے کی وجہ سے قرآن نے جہاں جہاں امر کو بیان کیا ہے حصر کے ساتھ بیان کیا ہے ....یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بجز اس کے کہ عالمِ غیب سے اللہ ان کے اوپر وحی بھیجتا ہے، بشریت ہی کے دائرے میں محصور رہے اور کوئی شعبہ الوہیت کا اس میں نہیں ہے۔" (صفحات ۱۱۹ - ۱۲۰)

"ضرب کلیم" میں مولانا کا اعتراض مہدی موعود کے بارے میں ہے۔ مہدی کے عنوان سے علامہ اقبال نے فرمایا ہے:

مجذوب فرنگی نے باندازِ فرنگی   مہدی کے تخیل سے کیا زندہ وطن کو

اے وہ کہ تو مہدی کے تخیل سے ہے بیزار   نومید نہ کر آہوئے مشکیں سے ختن کو

مولانا مرحوم لکھتے ہیں: "اس میں غالبًا روئے سخن میری طرف ہے، کیونکہ مہدی کے عقیدے کے اسلامی ہونے سے سب سے پہلے میں نے علی الاعلان انکار کیا ہے، اس لیے گذارش کرتا ہوں کہ "تخیل" سے مراد اگر عقیدہ ہے تو ہمارے پاس اس کا ایک معیار ہے یعنی کلام اللہ، اس میں کہیں مہدی بھیجنے کا وعدہ نہیں کیا گیا ہے، لہٰذا اگر ہم یہ عقیدہ رکھا بھی کریں تو اللہ کے اوپر کیا ذمہ داری ہے کہ وہ مہدی کو بھیجے اور اگر محض تخیل مقصود ہے تو مایوس قوموں کے تخیلات بھی ان کے لیے عذاب ہی ہوا کرتے ہیں، صدیوں پر صدیاں گذرتی جارہی ہیں اور امت ہے کہ اس امید میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہے کہ

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

کبھی کبھی جب مایوسی کا غلبہ ہوتا ہے تو گھبرا کے کہنے لگتی ہے:

یہ انتظارِ مہدی و عیسیٰ بھی چھوڑ دے

پھر مجبور ہوکر اسی ٹوٹی ہوئی امید کا سہارا لیتی ہے اور پکارتی ہے :

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا

غالباً اسی تخیل کا اثر ہے کہ ملت کے ان سربرآوردہ افراد کو بھی جو اس وقت تعمیرِ قوت میں سرگرم ہیں ، ڈاکٹر صاحب اپنے بلند معیار کے مطابق نہیں پاتے اور کہتے ہیں :

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی ۔۔۔ کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

دوسری بات یہ ہے کہ انھوں نے فرمایا ہے :

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے ۔۔۔ غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

یہ خالص شاعرانہ استدلال ہے ۔ غالب کی طرح جس نے کہا ہے :

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد ۔۔۔ مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

جس طرح مگس کی قے کہہ دینے سے شہد کی لطافت اور شیرینی میں فرق نہیں آسکتا ، اسی طرح محکومیت کی نسبت سے الہام بھی اگر حق ہو ، غارت گرِ اقوام نہیں ہوسکتا ۔ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام رومی سلطنت کے محکوم تھے جن کی نسبت ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے :

فرنگیوں کو عطا خاکِ سوریا نے کیا ۔۔۔ نبیِ عفت و غمخواری و کم آزاری

بلکہ اکثر انبیاء کرام علیہم السلام محکوم اقوام میں مبعوث کیے گئے جس کے خاص اسباب و علل تھے ، جن کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں ۔" (صفحات ۱۲۳ ۔ ۱۲۴)

یومِ اقبال میں مولانا کی شرکت

علامہ اقبال کی زندگی میں لاہور میں دو مرتبہ یومِ اقبال منایا گیا تھا ۔ پہلی مرتبہ ۶ مارچ ۱۹۳۲ء کو اور دوسری مرتبہ ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو یعنی علامہ اقبال کے انتقال سے چند ماہ پیشتر ۔ اسی دوسرے یومِ اقبال میں اساتذۂ جامعہ میں سے صرف مولانا اسلم صاحب مرحوم نے شرکت کی تھی اور ایک جزوی نشست کی صدارت بھی کی تھی ۔ اس سلسلے میں مولانا لکھتے ہیں " تیسری نشست میں جو شام کو ساڑھے چھ بجے شروع ہوئی ، اس میں علامہ عبداللہ یوسف علی صدر تھے ، اسی نشست میں بیگم شاہ نواز نے ایک مختصر تقریر فرمائی اور اعلان کیا کہ ان کے شوہر نے دس مربع زمین ڈاکٹر اقبال کے چھوٹے بیٹے جاوید کے نام

اسی اقبال ڈے کے سلسلے میں منتقل کر دی ہے۔۔۔۔ اس کے بعد علامہ عبداللہ یوسف علی نے اپنی جگہ پر مجھ کو بٹھادیا اور خود چلے گئے۔" آخر میں مولانا نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا: "ڈاکٹر اقبال کے کلام کا میں اس وقت سے سلسلہ وار مطالعہ کر رہا ہوں جبکہ آج سے ایک تہائی صدی پیشتر عبدالقادر کا رسالہ "مخزن" لاہور سے نکلتا تھا جس میں ان کی نظمیں چھپا کرتی تھیں۔ زمانۂ مابعد میں ڈاکٹر صاحب کی مثنویوں اسرار خودی و رموز بیخودی اور پیام مشرق، نیز جاوید نامہ وغیرہ پر میں نے تبصرے بھی لکھے جو ملک کے ممتاز رسالوں میں شائع ہوتے۔ ڈاکٹر صاحب کے کلام کے ساتھ میری دلچسپی اور گرویدگی کی خاص وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری سے شعر و ادب کی جس قدر خدمت کی ہے، اس سے کہیں زیادہ اسلام اور قرآن کی خدمت کی ہے۔"

اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مولانا نے علامہ اقبال سے ملاقات بھی کی، اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں: "دوسرے دن ہم ڈاکٹر اقبال سے ملے جو ہمارے منتظر تھے۔ ۹ بجے سے سلسلۂ گفتگو ساڑھے بارہ بجے تک رہا۔ امسال حج کی شرکت کا ارادہ رکھتے تھے، مگر بیماری اور کمزوری کی حالت یہ ہے کہ کوٹھی سے باہر نکلنا مشکل ہے۔ کہتے تھے کہ میں تو دو سال سے ارادتاً سفر حج میں ہوں، عملاً جب موقع اللہ دے، بلکہ وہ اشعار بھی لکھ لئے ہیں جو اس سفر سے متعلق ہیں، ان میں سے کہیں کہیں سے کچھ سنایا بھی، مکہ سے مدینہ کی روانگی کے وقت ایک غزل لکھی ہے، جس میں اللہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

تو باش اینجا و با خاصان بیامیز — کہ من دارم ہوائے منزل دوست

یہ شعر سناتے ہی گریہ ایسا گلوگیر ہوا کہ آواز بند ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے، مجھے یہ دیکھ کر مجبوراً موضوع سخن بدلنا پڑا۔" (آثار اقبال، صفحات ۸۷ تا ۹۰)

"میلاد آدم" کا منظوم ترجمہ

مولانا اسلم صاحب مرحوم نے اقبال کی مشہور نظم "میلاد آدم" کا منظوم ترجمہ بھی کیا ہے اور اس میں چند اشعار کا اپنی طرف سے اضافہ بھی کیا ہے۔ صحیح لطف تو جب آتا اصل نظم اور ترجمہ دونوں ساتھ ساتھ پیش کئے جاتے، مگر عدم گنجائش کی وجہ سے صرف ترجمہ اور اضافہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

عشق چیخ اٹھا کہ اک خونیں جگر پیدا ہوا — حُسن کانپ اٹھا کہ اک صاحب نظر پیدا ہوا

پہنچی گردوں سے شبستانِ ازل میں یہ خبر — پردہ دارو! ہوشیار، اک پردہ در پیدا ہوا

فطرتِ آشفتہ کہ خاکِ عالمِ مجبور سے — ایک خودگر، خودشکن اور خودنگر پیدا ہوا

آرزو تھی زندگی کی گود میں سوئی ہوئی — آنکھ کھولی اک جہانِ خیروشر پیدا ہوا

زندگی بولی کہ میں تھی آب وگِل میں مضطرب — یارے آج اس گنبدِ بے در میں در پیدا ہوا

اضافہ:

مسکرا کر یہ ملائک نے کہا، ابلیس سے — لو، تمھارا اک حریفِ تازہ تر پیدا ہوا

چرخ سے آئی صدا، اے ساکنانِ بحر و بر — اک جہاں آشوب، ظالم، فتنہ گر پیدا ہوا

جس کی خاطر یہ زمین و آسماں چکر میں تھے — مادرِ فطرت کا وہ اک نورِ نظر پیدا ہوا

تھا قضائے عالمِ ناسوت کا بربط خموش — آخر اس سازِ کہن کا زخمہ ور پیدا ہوا

(طلوعِ اسلام (دورِ جدید)، دہلی، دسمبر ۱۹۳۸ء)

"بالِ جبریل" جنوری ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی، مولانا نے اسے دیکھتے ہی برجستہ ایک قطعہ کہا جو اسی مہینے کے ماہنامہ "جامعہ" میں شائع ہوا۔ نامناسب نہ ہوگا اگر اس مضمون کو اسی قطعہ پر ختم کیا جائے:

اقبال ہم آہنگ سرودِ ازلی ہے — دیوان کو تو اس کے ذرا ایک نظر دیکھ

اشعار سے آتی ہے صدائے ملکوتی — اوراق پہ بکھرے ہوئے جبریل کے پر دیکھ

مولانا اسلم بحیثیت استاد

(ذیل میں مولانا محمد اسلم جیراجپوری مرحوم کے
بارے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تین سابق
طالب علموں کے مختصر تاثرات درج کئے جاتے
ہیں۔

رئیس احمد جعفری ندوی مرحوم

بلند پایہ عالم ہیں، تاریخ اسلام پر وسیع نظر رکھتے ہیں، متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، لیکن تاریخ الامت بہت مشہور و مقبول ہے، پہلے علی گڑھ کالج میں اسلامیات کے معلّم تھے، پھر جامعہ ملیہ کی تاسیس ہوئی، علی گڑھ کی آرام دہ نوکری چھوڑ دی اور جامعہ کے غریب خانہ میں آکر بیٹھ گئے۔ جامعہ پر بڑے بڑے نازک وقت آئے، لیکن اس ادارے سے ان کی وفاداری کبھی متزلزل نہیں ہوئی۔

مسلک اہل قرآن کے تابع ہیں، قدرتاً حدیث کو حجت نہیں مانتے، ان کے نزدیک وہی حدیث ہے، جس کی عمل متواتر سے تائید ہو، مسلک کے صواب، وخطا سے بحث نہیں، لیکن ان کی مذہبیت صداقت، دیانت اور دینی حمیت شک وشبہ سے بالاتر ہے، نماز بڑی پابندی سے پڑھتے ہیں اور حتی الامکان باجماعت، اپنے مسلک پر سختی سے قائم ہیں، لیکن اس موضوع پر گفتگو اسی سے کرتے ہیں جو خود کرنی چاہے، ورنہ خاموش رہتے ہیں۔

دل بغض، کینہ، عناد سے بالکل خالی ہے، بلکہ اس میں ان فنون لطیفہ کی سرے سے

گنجائش ہی نہیں۔

برائے کینۂ اغیار در دلم جا نیست

جس زمانے میں مولانا حدیث کی مذہبی حیثیت کے خلاف مقالات تحریر فرما رہے تھے، میں نے کئی مقالے ان کے جواب میں لکھے۔ مولانا خود بھی رسالہ جامعہ کے مدیر تھے۔ انھوں نے بڑی خندہ جبینی کے ساتھ انھیں جامعہ میں شائع کیا اور کبھی ایک لفظ ایسا نہیں کہا جس سے یہ اندازہ ہو کہ برہم ہیں۔ کبھی ایک بات ایسی نہیں کی جس سے یہ شبہ ہو کہ ناراض ہیں۔ شفقت و عنایت کا جو سلوک جامعہ میں میرے داخلے کے روز تھا بالکل یہی سلوک اس وقت بھی تھا جب میں تیز و تند لہجے میں ان کے خلاف مقالات لکھ رہا تھا۔ صرف یہی نہیں اس وقت بھی اور اس کے بعد بھی اگر کوئی موقع آیا تو انھوں نے میرے حق میں کلمۂ خیر کہنے اور اخلاقی امداد پہنچانے سے ذرا بھی دریغ نہیں کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ مولانا کے اس کردار نے میرے دل پر ایک ایسا نقش بٹھا دیا ہے جو کبھی نہیں مٹ سکتا۔

مولانا عربی ادب پر بھی بڑی وسیع نظر رکھتے ہیں اور فارسی ادب کے ماہر بھی ہیں۔ ہنگامۂ آزادی کے اس زمانے میں میری طبیعت فارسی کی طرف مائل ہوئی، میں نے مولانا سے اس شوق کا اظہار کیا، انھوں نے فوراً بغیر کسی تامل کے اوقات درس میں سے وقت نکال کر مجھے فارسی پڑھانا شروع کر دیا اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک میں نے چاہا، مولانا کی مستعدی اور توجہ میں کبھی ذرا بھی فرق نہیں آیا۔

مولانا کا سب سے بڑا اور میری نظر میں قابلِ تقلید وصف یہ کہ انھوں نے کبھی بھی طلبہ کو اپنے ذاتی خیالات و معتقدات سے متاثر کرنے کی کوشش نہیں کی، صرف اپنے کام سے کام رکھا، ان کے متعدد شاگردوں کو ان کے مسلک کا علم اس وقت ہوا، جب انھوں نے جامعہ میں ان کے مقالات دیکھے، ورنہ وہ برسوں سے پڑھ رہے تھے اور ان کے فیضِ تعلیم سے بہرہ ور ہو رہے تھے، کبھی انھیں شبہ نہیں گزرا کہ مولانا کے مسلک میں انفرادیت ہے اور وہ اپنا کوئی مخصوص و جداگانہ مسلک رکھتے ہیں۔

مولانا جید عالم ہیں، لیکن ان کے لباس سے کوئی نہیں پہچان سکتا، نہ جبّہ اور عمامہ کے

پابند ہیں، نہ وعظ و تلقین کے، عام آدمیوں میں عام آدمیوں کی طرح رہتے ہیں۔ یہ ہے ان کی بےنفسی اور بے لوثی۔

(اقتباس از دید و شنید از رئیس احمد جعفری صفحہ ۶۱ تا ۶۳)

مشیر الحق (جامعہ ملیہ)

بزرگوں پر لکھنا خاصا مشکل کام ہے، خصوصاً جب مولانا ایسے بزرگ پر لکھنا پڑے مولانا کے بارے میں ابھی تک میں یہی نہیں طے کر پایا کہ انھیں کس صف میں رکھوں۔ ایک عالم کی حیثیت سے دیکھوں یا مبلغ کی حیثیت سے ـــ انھیں مصنف سمجھوں یا مدرّس! کیونکہ مولانا میں مختلف صفتیں کچھ اس طرح مل جل کر رچ بس گئی تھیں کہ ان کی کوئی ایک حیثیت متعین کرنا، کم سے کم، میرے لئے تو بہت ہی مشکل کام ہے۔

یہاں آنے سے پہلے میں نے ان کے عقائد کے بارے میں کچھ اس قسم کی روایتیں سُن رکھی تھیں کہ یہاں داخلہ لیتے وقت میرے دل میں ان کے لئے کوئی جذبۂ احترام نہ تھا۔ لیکن وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے:

جو دیکھا تو تھے رہزنِ ہوش و تمکیں
جو برتا تو بالکل کرم ہی کرم تھے

تو بس چند ملاقاتوں میں یقین آ گیا کہ مولانا کے بارے میں لوگ بہت زیادہ غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ اس غلط فہمی کی سب سے بڑی وجہ شاید یہ تھی کہ ان کے بعض خاص شاگردوں نے، بازار میں اپنی ساکھ پیدا کرنے کے لئے، ان کی ذات کو، اور ان کے نام کو بہت غلط طریقے سے استعمال کیا، انھوں نے اپنی قیادت کا سکہ چلانے کے لئے، مولانا کو دنیا کے سامنے ایک داعی، ایک مبلغ، ایک کنوینر کی حیثیت سے پیش کیا، حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ مولانا کی سب سے بڑی خصوصیت یہی تھی کہ وہ اپنے خیال کے مبلغ کبھی بھی نہیں رہے۔ انھوں نے سوچنے کی دعوت ہر ایک کو دی لیکن ایمان لانے پر کسی کو مجبور نہیں کیا۔

مولانا میں مزاج شناسی کا ملکہ حد سے زیادہ تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مختلف فکر و خیال

اور مختلف ذوق و نظر کے لوگ ان کی مجلسوں میں آتے، ان سے خوب کھل کر گفتگو کرتے، اور اس طرح واپس جاتے کہ دوبارہ پھر آتے ۔ مجھے مختلف بزرگوں اور صاحبان علم و فضل کی مجلسوں میں شریک ہونے کی سعادت حاصل ہوئی ہے ۔ لیکن جو "پُر وقار بے تکلفی" ہمارے مولانا کے یہاں تھی وہ مجھے آج تک کہیں نظر نہ آئی ـــــ ان کی آخری بیماری کے زمانہ میں ایک شام میں اُن کے یہاں گیا اس وقت وہ چاندخاں سے کسی موضوع پر ہنس ہنس کر تبادلۂ خیال کر رہے تھے ۔ میں جب پہونچا تو مجھ سے باتیں کرنے لگے ۔ ابھی پاکستان تک پہونچے تھے کہ تاباں صاحب کی چھوٹی بچی نینتو آ کر ان کی گود میں بیٹھ گئی ۔ مولانا نے اپنے ہاتھوں کے ذریعہ اس سے باتیں شروع کیں اور زبان سے مولانا مودودی کے نظام اسلامی اور پرویز صاحب کے نظام قرآنی پر بحث کرتے رہے تھوڑی دیر کے بعد کچھ اساتذہ آ گئے تو ان لوگوں سے ان کے پسندیدہ موضوع پر گفتگو کرنے لگے ۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد اڑوس پڑوس کی چند لڑکیاں اپنے بابا کا حال پوچھنے آ گئیں ۔ ایک نے پوچھا، بابا، اب کیسی طبیعت ہے ؟" بابا اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور بولے ۔ "اب بابا کو پوچھنے آئی ہو ۔ کل تم لوگوں نے اکیلے اکیلے پھلکیاں پکا کر اڑائیں تب بابا یاد نہیں آئے ۔" پھلکیاں شاید ایک لڑکی کی نازک رگ تھی اس لئے دوسری لڑکیوں نے تو منہ میں دوپٹے ٹھونس ٹھونس کر ہنسنا شروع کیا اور اس بے چاری نے صفائی دینی شروع کی ۔ لیکن مولانا تھے کہ ہنس ہنس کر اصرار کر رہے تھے اور اُسے چھیڑ رہے تھے کہ "اونہوں، مجھے یقین نہیں، تم لوگوں نے اکیلے اکیلے پھلکیاں ضرور اڑائی ہیں ـــــ اچھا، اب اس کی سزا یہ ہے کہ کل تم سب لوگ میرے گھر میں آ کر پھلکیاں تلو، خوب کھاؤ" ـــــ پھر ذرا بھرائی آواز سے بولے ـــــ "اور اپنے بابا کو دکھا دکھا کر کھاؤ کہ اسے پھلکی کھانا منع ہے ۔"

مولانا کسی زمانے میں شعر بھی کہتے تھے ۔ ادھر بہت دنوں سے کہنا تو چھوڑ دیا لیکن کہنے والوں کی صدارت ایک خاص شان سے کرتے تھے اکثر باتوں ہی باتوں میں بہت پتے کی بات کہہ جاتے تھے ۔ اُس برس عید الضحیٰ کی نماز کے موقع پر جب مولانا بھوپال گراؤنڈ پہونچے تو جماعت کا وقت ہو چکا تھا ۔ گھر سے گراؤنڈ تک پیدل آتے آتے بہت تھک گئے تھے ۔ سانس قابو میں نہیں تھی ۔ چونکہ عبدالغفار صاحب مدہولی اس مرتبہ یہاں موجود نہیں تھے اس لئے بعض

لوگوں نے اپنی گھڑی کو "معیار" سمجھ کر مولانا سے جھوٹتے ہی کہا "چلئے مولانا وقت ہوگیا۔" مولانا پھولتی ہوئی سانس کو قابو میں لاتے ہوئے بولے :

ابھی چلتا ہوں ذرا ہوش میں آلوں تو چلوں

یہ کہا اور فرش پر بے دم ہو کر بیٹھ گئے ۔

بیماری سے کچھ دن پہلے اپنے شاگرد غلام احمد پرویز (مدیر طلوع اسلام) کی دعوت کے جواب میں لکھا ـــــ "تم نے مجھے بلایا ہے لیکن :

میں وہ قطرہ ہوں شبنم کا جو ہو خارِ مغیلاں پر

اب پیرانہ سالی کہیں کے سفر کی اجازت نہیں دیتی سوائے ایک سفر کے !"

ابھی اسی مرتبہ جب مولانا، بی ۔ اے کی اسلامیات کا ریکارڈ دیکھ چکے تو ایک دن میں نے ان سے پوچھا، "ہم لوگوں کے ریکارڈ کے بارے میں کیا خیال ہے ؟" کہنے لگے "سب پاس ہیں"۔ طالب علم کی نفسیات سے تو آپ لوگ واقف ہی ہیں کہ نتیجہ الیشوع ہونے سے پہلے پہلے اس کو نتیجہ معلوم کرنے کی کتنی فکر ہوتی ہے اور اس کے لئے وہ کیا کیا تدبیریں کرتا ہے ۔ اس وجہ سے میں نے پھر کہا ۔ "پاس تو خیر سب ہوں گے ہی، لیکن کچھ اونچ نیچ بھی تو ہوگی، میرا مطلب ہے ....." بات کاٹ کر بولے "جی مطلب خوب سمجھتا ہوں لیکن کیا اونچ نیچ، بس یوں سمجھئے کہ مال یکساں، لیبل یکساں، صرف پیکنگ مختلف، اور قیمت، ہر مال ملے گا چھ آنے ۔"

اس شگفتگی مزاج کے باوجود طبیعت حد درجہ سادہ تھی، انتہائی سادہ ! لیکن بہت ہی نفیس ـــــ سادگی اور نفاست کے ساتھ ساتھ اختصار پسندی، ان کی زندگی میں کچھ اس طرح رچ بس گئی تھی کہ یہ کہنے میں کوئی تضاد نہیں ہے کہ مولانا کی عمر طویل لیکن زندگی بہت مختصر تھی۔ کھانے پینے میں اختصار، اوڑھنے پہننے میں اختصار؛ حد تو یہ ہے کہ مصنف اور مدرس ہونے کے باوجود لکھنے اور بولنے میں بھی اختصار سے کام لیتے تھے ۔ لیکن جس طرح ان کی زندگی میں سادگی کے ساتھ نفاست تھی اسی طرح اختصار کے ساتھ جامعیت بھی تھی۔

پچھلے سال میں نے مولانا سے کورس کے علاوہ فارسی پڑھنے کا شوق ظاہر کیا۔ تھوڑی بہت فارسی میں پہلے سے جانتا تھا اس لئے انھوں نے مجھے گلستاں شروع کرائی۔ بہ منت کے

گھنٹے میں مولانا رکوع ڈیڑھ رکوع قرآن پڑھاتے تھے۔ اس کے بعد مجھے تین چار صفحے گلستاں کے پڑھاتے تھے۔ پھر بھی اتنا وقت بچ جاتا تھا کہ وہ "ہندوستان ٹائمز" کے پہلے صفحے پر ایک سرسری نظر ڈال لیتے تھے۔ اس کے باوجود کبھی سبق میں "بھاگم بھاگ" والی کیفیت نہ پیدا ہوتی۔ وہ چند جملوں میں بڑی سے بڑی عبارت کا مطلب اس طرح سمجھا دیتے کہ ہمیں اکثر یہ سوچنا پڑتا کہ آخر اس میں سمجھنے کی کیا بات تھی۔

مولانا بڑے وضعدار تھے ـــــ شاید یہ ان کی وضعداری ہی تھی کہ انھوں نے مرنے میں بھی اختصار پسندی کا نمونہ قائم کر دیا، اور اپنی وضع سے نہ ہٹے۔ "چٹ پٹ ختم" کو اب تک میں زبان کا ایک محاورہ سمجھتا تھا لیکن استاد مرحوم پر اللہ تعالیٰ رحمتوں کے پھول برسائے کہ انھوں نے میرے ایسے اپنے بہت سے شاگردوں کو اس محاورہ کا مطلب چند منٹ میں سمجھا دیا۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

محمد سالم قدوائی (علی گڑھ)

اپنے والد، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کے ساتھ، ۱۹۵۱ء میں جامعہ آیا تو میرا داخلہ نویں جماعت میں ہوا اور جب دسویں کلاس پاس کر کے کالج میں آیا تو مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپوری کو قریب سے دیکھنے اور براہ راست استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ مولانا ہم لوگوں کو اسلامیات میں قرآن مجید کی تفسیر پڑھاتے تھے، میں نے اختیاری مضامین میں عربی لی تھی اس لئے ایک گھنٹہ وہ عربی کا بھی پڑھاتے تھے۔ اس زمانے کا نصاب تعلیم آج کل کے نصاب سے کہیں زیادہ اور مشکل ہوا کرتا تھا، مولانا کے پڑھانے کا انداز بہت ہی سلجھا ہوا اور دلنشین ہوتا تھا۔ عبارت پڑھوا کر اس کا ترجمہ اور تشریح اس طرح کرتے تھے کہ مشکل سے مشکل عبارتیں اور مسائل بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتے تھے۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ میراث سے متعلق جو آیات ہمارے کورس میں شامل تھیں مولانا ان آیات اور متعلقہ مسائل کی وضاحت بڑے

اچھے انداز سے کرتے تھے، ہمارے ہر سوال کا جواب پوری تفصیل سے دیتے اور مثالوں کے ذریعے اپنی بات کی وضاحت کرتے اور ہر الجھن کو بڑی خوبی سے دور کر دیتے۔ عربی کے کورس میں "قصیدہ بانت سعاد" داخل تھا۔ یہ قصیدہ خاصا مشکل ہے، میں نے کلاس میں پڑھ تو لیا لیکن امتحان کے قریب کافی حصہ سمجھ میں نہ آیا، مولانا سے کہا تو گھر بلا کر اتنی اچھی طرح سے سمجھایا کہ اس کا مفہوم پوری طرح سے ذہن نشین ہو گیا اور اب بھی جتنا یاد ہے انھیں کی دین ہے۔

اسلامی علوم اور خاص طور سے تاریخ پر مولانا کی نظر بہت اچھی تھی۔ "تاریخ الامت" اس کی جیتی جاگتی مثال ہے، زبان بہت ہی آسان، شگفتہ اور رواں لکھتے تھے۔ قرآن مجید پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ تمام مسائل کو وہ قرآن ہی سے حل کرتے تھے۔

مولانا ایک اچھے انشاء پرداز اور صاحب طرز ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ شاعر بھی تھے، اس کا علم تو مجھے نہیں ہے کہ ان کا کوئی مجموعۂ کلام شائع ہوا یا نہیں لیکن ان کے اشعار مختلف پرانے رسالوں میں دیکھے ہیں۔ جامعہ میں بہت سی شعری محفلوں کی صدارت بھی کرتے ان کو دیکھا ہے۔ ایسے مواقع پر وہ ایک عالم دین کے بجائے، ایک صاحب ذوق شاعر اور صاحب نظر ادیب بھی معلوم ہوتے تھے۔

ان کی زندگی بڑی سادہ تھی۔ میں نے ان کو ہمیشہ معمولی کپڑے پہنے دیکھا۔ سردیوں میں ایک خاص قسم کی عبا پہنا کرتے تھے۔ جوتے بھی عام طور سے بہت معمولی قسم کے ناگرہ استعمال کرتے تھے، ان کے گھر جانے کا اکثر اتفاق ہوا وہاں بھی ہر طرف سادگی ہی نظر آتی تھی۔ چائے کے خاصے شوقین تھے لیکن گھر پر کبھی بھی چائے کی پیالیاں ایک قسم کی نظر نہ آئیں، یہاں تک کہ جو بھی مہمان آتا پوری بے تکلفی سے اس کے سامنے بھی وہی پیش کرتے، ظاہر و باطن میں کوئی فرق نہ تھا۔ گھر کا دوسرا سامان کرسی، چارپائی، بستر وغیرہ سبھی بہت سادہ قسم کے تھے ـــــ مطالعہ بہت کرتے تھے، ہر شخص ان کی بے حد عزت کرتا تھا، خیالات کے اعتبار سے بہت سلجھے ہوئے تھے، ان کے یہاں کہیں بھی کٹرپن یا قدیم الخیالی کی جھلک نہ ملتی تھی۔

مولانا جامعہ میں سیاست سے تقریباً بالکل الگ ہو کر اپنی زندگی گذارتے تھے۔ سب لوگ ان کی بزرگی اور عظمت کے قائل تھے اور ہر چھوٹے بڑے معاملے میں ان کا مشورہ ضروری

سمجھتے تھے، ان کے انتقال پر جامعہ کی فضا میں کئی دنوں تک رنج وغم اور گہرے سوگ کی کیفیت طاری رہی، ہر چھوٹا بڑا یکساں طور پر متاثر تھا، چھوٹوں کو غم تھا کہ اب بابا جیسی شفیق ہستی انھیں کہاں ملے گی، جوان طلباء کو افسوس تھا کہ اب ان کی ہمت بندھانے اور مشکل سوالات کو حل کرنے میں کون ان کی مدد کرے گا، بزرگوں اور دوستوں کو یہ صدمہ تھا کہ شیخ کارواں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا، اب ان کی جیسی پیشوائی اور رہنمائی کرے گا۔

ان کے انتقال کے وقت میں جامعہ کالج کے طلباء کی یونین کے قلمی رسالہ "جوہر" کا ایڈیٹر تھا، میں نے مولانا کے انتقال پر جامعہ کے اہم لوگوں سے مضامین حاصل کئے اور انھیں مولانا اسلم نمبر کی شکل میں مرتب کیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اس میں پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر سید عابد حسین، ڈاکٹر سعید انصاری، مولانا عبدالسلام قدوائی، بیگم صالحہ عابد حسین اور بعض دوسرے لوگوں کے مضامین شامل تھے۔ یہ رسالہ حسب قاعدہ کتب خانے کو دے دیا گیا تھا، اگر محفوظ ہوگا تو اس سے مولانا مرحوم کی سیرت وشخصیت اور ان کی علمی وادبی خدمات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔

۱۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں تھیں: (۱) پیغمبری یعنی پیغام الٰہی کو لوگوں کے پاس بے کم وکاست پہنچا دینا، اس حیثیت سے آپ کی تصدیق کرنا اور آپ کے اوپر ایمان لانا فرض کیا گیا (۲) امامت یعنی امت کا انتظام، اس کی شیرازہ بندی، ان کے باہمی قضایا کے فیصلے، تدبیر، مہمات جنگ وصلح وغیرہ اجتماعی امور میں ان کی قیادت اور قیام نماز وغیرہ، اس حیثیت سے آپ کی اطاعت اور فرماں برداری لازمی کی گئی۔"

محمد اسلم جیراجپوری

(جامعہ، اپریل ۱۹۳۸ء، صفحہ ۲۳۲)

عبداللطیف اعظمی

مولانا اسلم مرحوم کی کتابوں کی توضیحی ببلیوگرافی

۱۔ علوم عرب (ترجمہ)

ترجمہ : تاریخ التمدن الاسلامی، مصنفہ : علامہ جرجی زیدان، سائز ۲۰×۲۶/۸، حجم ۲۳۷ صفحات، کتاب ٹائپ میں چھپی ہے، مطبوعہ : انسٹی ٹیوٹ پریس۔ علی گڑھ۔

سنہ طباعت : ۱۹۰۷ء

کتاب کے شروع میں فاضل مترجم نے لکھا ہے : "... اس علمی ترقی کی تاریخ کو جو مسلمانوں نے کی ہے، مدون نہ کرنا ایک ایسی کمی تھی جس کو کم سے کم میں بہت زیادہ محسوس کرتا تھا اور عرصے سے اس فکر میں تھا کہ جس طرح ہو سکے، کوشش کر کے اس قسم کی ایک تاریخ لکھوں جس میں علوم عرب کی ترقی اور اس کے تمام مدارج کی کیفیت تفصیل کے ساتھ درج کی جائے۔ اسی دوران میں علامہ جرجی زیدان، ایڈیٹر "الہلال" (قاہرہ، مصر) کی کتاب تمدن الاسلام مطالعہ میں آئی، اس کی تیسری جلد میں میری وہی آرزو تھی جو دو سال سے متواتر میرے دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی، اس کو دیکھتے ہی یہ کانٹا دل سے نکل گیا.... اس لیے میں نے فوراً ہی ترجمہ کرنا شروع کیا اور بہت جلد تھوڑی سی محنت میں یہ دلچسپ اور پُراز معلومات کتاب اردو میں آگئی اور وہ ناگوار کمی پوری ہوگئی۔"

۲۔ تاریخ القرآن

سائز $\frac{18\times22}{8}$، حجم ۱۲۶ صفحات، پہلا ایڈیشن: ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء، دوسرا ترمیم شدہ ایڈیشن: ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۲ء

مولانا نے اس کتاب میں نزول قرآن کے آغاز و تاریخ پر روشنی ڈالی ہے اور آخری آیت کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھا ہے: "نزول کے لحاظ سے سب سے آخری سورت "برائت" ہے، اس کے آخر کی دونوں آیتیں عرش کا آخری پیغام ہیں جن کے اترنے کے ۹ دن کے بعد نبوت کا دنیا سے خاتمہ ہوگیا۔" (صفحات ۲۵-۲۶) اس کے علاوہ اس کتاب میں قرآن و حدیث، ترتیب قرآن، ربط قرآن، حفاظت قرآن، جمع قرآن، مصحف عثمانیؓ، شیعہ اور قرآن، حروف مقطعات اور نسخ آیات جیسے اہم مسائل اور موضوعات پر بحث و گفتگو کی گئی ہے۔ اس کتاب کے بارے میں پیش نظر شمارے میں ایک مضمون شائع کیا جارہا ہے۔

۳۔ حیاتِ حافظ

سائز $\frac{18\times22}{8}$، حجم ۱۴۴ صفحات، پہلا ایڈیشن ۱۹۰۹ء، تیسرا ایڈیشن: ۱۳۳۹ھ/۲۱-۱۹۲۰ء۔ مطبوعہ: مطبع فیض عام، علی گڑھ

"اس کتاب میں خواجہ حافظ شیرازی کی زندگی کے حالات ہیں اور ان کی شاعری پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے۔" (سرورق)

۴۔ حیاتِ جامی

سائز $\frac{18\times22}{8}$، حجم ۸۰ صفحات، پہلا ایڈیشن: ۱۹۱۱ء،
مطبوعہ: مطبع احمدی، علی گڑھ

"اس کتاب میں مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامی، فارسی کے مشہور شاعر کی زندگی کے مکمل حالات اور ان کے علمی کارنامے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں، نیز

ان کے تصوف اور عشق کے واقعات اور لطائف و ظرائف کا بھی بیان ہے اور ان کی تمام تصانیف کی کیفیت ان کی شاعری پر محققانہ تنقید لکھی گئی ہے۔" (سرورق) اس شمارے میں مولانا اسلم مرحوم کی فارسی شاعری پر ایک مضمون شائع ہو رہا ہے اس میں "حیاتِ حافظ" اور "حیاتِ جامی" کا بھی ذکر ہے

۵۔ خواتین

سائز $\frac{۲۲\times۲۸}{۱۶}$، حجم ۳۸۴ صفحات، پہلا ایڈیشن : ۱۹۱۴ء، دوسرا ایڈیشن : نومبر ۱۹۵۱ء

اس کتاب میں ۳۳ مشہور اسلامی خواتین کے حالات زندگی ہیں جو رسالہ "خاتون" میں، جو علی گڑھ کالج کے شعبۂ نسواں سے شائع ہوتا تھا، وقتاً فوقتاً شائع ہوئے تھے، ان مضامین کے بارے میں مولانا اسلم صاحب نے وضاحت فرمائی ہے کہ : "ان خواتین میں سے ۱۷ کے حالات میرے لکھے ہوئے ہیں اور ۴ بیگمات کے حالات مولوی محبوب الرحمٰن صاحب کلیم مرحوم نے لکھے جو میرے چچا ہوتے تھے، بقیہ بھی سوائے چند کے میں نے ہی اپنے پاس آنے والے لوگوں سے لکھوائے۔" (صفحہ ۸)

۶۔ عربی خط

سائز $\frac{۲۰\times۳۰}{۸}$، ضخامت ۲۵ صفحات، سنہ طباعت : ۱۹۲۰ء

مولانا مرحوم کے ایک مضمون کی آف پرنٹ ہے، جس کے ذیلی عنوانات حسب ذیل ہیں :

(۱) عربی خط کی ایجاد اور اس کا ماخذ (۲) اعراب یعنی حرکت اور وقف (۳) عربی خط پر اعتراض (۴) ایک غلطی کا ازالہ (۵) عربی خط اور اسلام (۶) خط کوفی (۷) خط نسخ (۸) سامان کتابت (۹) عربی خط کی مقبولیت (۱۰) مردم شماری (۱۱) ترکی زبانیں (۱۲) فارسی (۱۳) ہندی زبانیں (۱۴) افریقی زبانیں (۱۵) عربی خط اور یورپ۔

۷۔ الوراثۃ فی الاسلام (عربی)

۸۔ محجوب الارث

مذکورہ بالا دونوں کتابیں، مجھے نہیں مل سکیں، غالباً یہ دونوں کتابیں ۱۹۲۲ء میں علی گڑھ سے شائع ہوئی ہیں۔ جنوری ۱۹۲۴ء کے ماہنامہ "جامعہ" میں مولانا کی دوسری کتابوں کے ساتھ ان دونوں کتابوں کا اشتہار شائع ہوا ہے اور اس سے کئی سال قبل ماہنامہ "معارف" (اعظم گڈھ) کے جولائی اور اگست ۱۹۱۸ء کے شماروں میں مولانا کا ایک طویل مضمون "محجوب الارث" کے عنوان سے دو قسطوں میں شائع ہوا تھا۔

جولائی ۱۹۲۳ء کے ماہنامہ "جامعہ" میں "الوراثۃ فی الاسلام" پر "ناقد" کے قلم سے حسب ذیل تبصرہ شائع ہوا ہے:

"اسلامی فن وراثت ائمہ کے زمانے میں جس طرح مرتب ہو گیا تھا اسی طرح آج تک چلا جاتا ہے، زمانۂ مابعد میں علما و فقہا نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ ہمارے جامعہ کے استاد تاریخ اسلام مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری نے اس فن پر محققانہ طریقے سے بحث کی ہے اور عربی زبان میں نہایت اختصار اور صفائی کے ساتھ بالکل جدید طرز سے اس فن کو مرتب کیا ہے، پہلے ان بنیادی اور اصولی خرابیوں کو دکھلایا ہے جو اس فن کی ترتیب میں واقع ہوئی تھیں، اس کے بعد قرآن مجید کی صرف چار آیتوں کو جو وراثت سے متعلق ہیں، تفصیل کے ساتھ تفسیر کی ہے اور انھیں سے فرائض کے کل اصول مستنبط کئے ہیں، اس کے بعد پھر انھیں اصول پر اس فن کی نئی تعمیر کھڑی کی ہے۔"

(۹) سیرت عمرو بن عاص (فاتح مصر)

سائز $\frac{20 \times 26}{8}$، حجم ۱۰۴ صفحات، مطبع جامعہ ملیہ علی گڑھ، سنہ طباعت: ۱۹۲۴ء / ۱۳۴۳ھ۔

کتاب کے شروع میں فاضل مصنف نے لکھا ہے: "حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ جو فتوحات اسلامیہ کے ایک عظیم الشان بطل اور دولت عربیہ کے ایک زبردست رکن تھے، جماعت صحابہ

میں اپنی اس خصوصیت میں نمایاں تر ہیں کہ میدانِ شجاعت اور مضمارِ سیاست دونوں کے شہسوار ہیں، اگر ایک طرف جنگ و جہاد میں وہ حضرت خالد بن ولید اور سعد بن وقاص کے دوش بدوش ہیں تو دوسری طرف حزم و تدبیر میں حضرت عمر اور امیر معاویہ کے پہلو بہ پہلو ہیں۔"

۱۰۔ تاریخ نجد

سائز ۲۰×۲۶/۸، حجم ۳۰۴ صفحات، سنہ اشاعت: ۱۹۲۶ء۔

"مولانا اسلم جیراجپوری، استاد تاریخ جامعہ ملیہ نے اس تحریک [نجدی تحریک] کے ابتدا سے لیکر آج تک کے مکمل حالات اختصار کے ساتھ لکھ کر مندرجہ بالا عنوان سے شائع کر دئے۔ اس کتاب کا ماخذ بیشتر خود علماء نجد کی تصانیف اور علامہ آلوسی زادہ شکری بغدادی کی تاریخ کی وجہ سے اس کتاب کا پایۂ اعتبار نہایت بلند ہے۔ پہلے نجد کا جغرافیہ اس کے اضلاع اور ان کی آبادیوں کی تفصیل ہے، پھر اہل نجد کے تمدنی، اخلاقی، معاشرتی، دینی اور علمی زندگی وغیرہ کی کیفیت ہے، اس کے بعد شیخ محمد بن عبدالوہاب کی زندگی کے حالات اور ان کے علمی و عملی کارناموں کا بیان ہے، پھر ان کی تعلیمات اور دعوت و تحریک وہابیت پر مفصل بحث ہے۔ یہ کتاب نجد اور نجدی تحریک کے متعلق اردو زبان میں سب سے پہلی کتاب ہے...." (ماہنامہ جامعہ، مئی ۱۹۲۶ء)

۱۱۔ جواہر ملیہ (مجموعۂ نظم)

سائز ۱۸×۲۲/۸، حجم ۲۴ صفحات، مطبوعہ: مطبع جامعہ ملیہ، دہلی،

دوسرا ایڈیشن: ۱۹۳۰ء۔

اس مجموعے میں حسب ذیل نظمیں شامل ہیں، جن میں پہلی نظم اکتوبر ۱۹۱۸ء کی اور آخری مارچ ۱۹۲۴ء کی ہے:

(۱) مساوات پسندی (۲) تلہیت (۳) استغنائے علم (۴) حلاوتِ علم (۵) جذبۂ اخلاص (علی برادران کی پہلی رہائی کی خوشی میں کہی گئی) (۶) شمع ملت (۷) نوید امید (ستمبر ۱۹۲۳ء میں مولانا

محمد علی جوہر کی دوسری رہائی کے موقع پر کہی گئی) (۸) جزیرۃ العرب (۹) حلم دشمن نواز (مثنوی)
(۱۰) اسلامی صدا (طلبائے جامعہ کے لئے)

۱۲۔ تعلیماتِ قرآن (متعلقہ اصولِ دین و عقائد)

سائز $\frac{۲۰ \times ۲۶}{۸}$، حجم ۲۲۸ صفحات، مطبوعہ: دہلی، سنہ اشاعت: ۱۹۳۴ء
دیباچہ اور تمہید کے علاوہ حسب ذیل عنوانات پر یہ کتاب مشتمل ہے:
(۱) اللہ (۲) مخلوق (۳) دین (۴) رسالت (۵) کتاب (۶) معاد۔ فاضل مصنف نے لکھا ہے کہ: "ان میں عقائد کے جملہ مہات اصول آجاتے ہیں" (صفحہ ۷)

۱۳۔ نکات قرآن

یہ کتاب مجھے نہ مل سکی۔ ایک اشتہار میں اس کے بارے میں لکھا ہے: "قرآن کریم کے سیکڑوں نکتے بطور سوال و جواب لکھے گئے ہیں۔ سوالات قرآن سے لئے گئے ہیں اور جوابات بھی قرآن سے دئے گئے ہیں۔"

۱۴۔ مقالاتِ اسلم (مجموعہ مضامین)

مرتبہ: مولانا امداد صابری، سائز $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۱۶}$، حجم ۱۹۶ صفحات، مطبوعہ: دہلی، سنہ طباعت کتاب میں درج نہیں، فاضل مرتب نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ غالباً ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی، شروع میں مولانا کی تصویر بھی ہے۔
اس کتاب میں پیش لفظ (از مرتب) کے علاوہ حسب ذیل مضامین شامل ہیں:
(۱) میری طالب علمی (۲) گنبدِ خضرا (۳) جاوید نامہ (۴) پیام مشرق (۵) مثنوی اسرار خودی (۶) مثنوی مخزن الاسرار (۷) جغرافیہ اور مسلمان (۸) نادر شاہ اور اتحاد سنی و شیعہ

۱۵۔ ارکانِ اسلام

۱۶۔ عقائدِ اسلام

یہ دونوں کتابیں بچوں کے لیے آسان زبان میں مختصر طور پر لکھی گئی ہیں اور غالباً ان کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا ہے۔

۱۷۔ نوادرات (مجموعۂ مضامین)

سائز $\frac{۲۶ \times ۲۰}{۸}$ ، حجم ۳۹۹ صفحات ، مطبوعہ: کراچی ، تاریخ پیش لفظ، یکم اکتوبر ۱۹۵۱ء۔

اس مجموعے میں حسب ذیل مضامین شامل ہیں:

(۱) آنحضرت کا بچپن (۲) اسوۂ محمدیہ پر ایک نظر (۳) معراج (۴) معاہدہ نبوی (۵) ختم نبوت (۶) گنبد خضرا (۷) حضرت ابوذر غفاری (۸) حضرت اویس قرنی (۹) صباح (۱۰) حلیمہ نجدیہ (۱۱) مثنوی اسرار خودی (۱۲) پیام مشرق (۱۳) جاوید نامہ (۱۴) ضرب کلیم (۱۵) پہلا یوم اقبال (۱۶) مثنوی مخزن الاسرار (۱۷) التفہیمات الالٰہیہ (۱۸) اسباب زوال امت (۱۹) مسئلہ خلق قرآن (۲۰) وہم تعارض (۲۱) وقف کی دینی حیثیت (۲۲) ملک یمین (جنگی تیدیوں کے بارے میں قرآن کی روشنی میں) (۲۳) جغرافیہ اور مسلمان (۲۴) عربی خط (۲۵) نابینائی (۲۶) نادر شاہ اور اتحاد سنی و شیعہ (۲۷) سفر حج (۲۸) حالات حج (۲۹) حقیقت حج (۳۰) میری طالب علمی (یہ مضمون مکمل طور پر اس نمبر میں شامل ہے)

۱۸۔ ہمارے دینی علوم (مجموعۂ مضامین)

سائز $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۱۶}$ ، حجم ۱۸۱ صفحات ، سنہ اشاعت درج نہیں۔

"پیش رس" (از مولانا محمد حسین عرشی امرتسری) کے علاوہ مولانا کے حسب ذیل مضامین اس میں شامل ہیں:

(۱) علم تفسیر (۲) تفسیر بالروایت (۳) علم حدیث (۴) حقیقت حدیث (۵) علم فقہ۔

یہ مضامین، بقول عرشی صاحب "وقتاً فوقتاً بلاغ، البیان وغیرہ رسائل میں شائع ہوئے یا بعض مجالس میں پڑھے گئے۔"

۱۹۔ ۲۶۔ تاریخ الامت

یہ کتاب ۸ جلدوں میں ہے، جب مولانا مدرسۃ العلوم (علی گڑھ) میں تھے اس وقت اس کی تالیف شروع کی تھی مگر اس کی پہلی جلد جو سیرت سے متعلق ہے، اُس وقت شائع ہوئی جب مولانا جامعہ ملیہ میں آگئے، پہلی اور دوسری جلد (خلافت راشدہ) ۱۹۲۲ء میں اور تیسری جلد (خلافت بنو امیہ) ۱۹۲۳ء میں اور آٹھویں جلد (تاریخ اسلام اور قرآن) ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی۔ آخری جلد کی تمہید میں اس کتاب کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے فاضل مؤلف نے لکھا ہے کہ: "تاریخ الامت کے ساتوں حصوں میں مسلمانوں کی مرکزی تاریخ اختصار کے ساتھ بیان کر دی گئی ہے اور اس میں عہد رسالت سے ترکوں کے الغائے خلافت تک کے حالات آگئے ہیں۔ اس تاریخ کا عمود خلافت اسلامیہ ہے یعنی سیرت کے بعد خلفائے راشدین، بنی امیہ، عباسیہ بغداد، عباسیہ مصر، نیز فاطمئین اور خلفائے عثمانیہ۔ دیگر مسلمان خاندان جن کی سلطنتیں مختلف ملکوں اور اقلیموں میں قائم ہوئیں ان کے تذکرے ضمناً لکھے گئے ہیں۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ آسان عبارت میں مختصر طریقے سے ضروری تاریخی معلومات پیش کر دی جائیں، تاکہ امت کی پوری تاریخ اور اس کی عہد بعہد کی رفتار کا ایک اجمالی نقشہ سامنے آجائے۔"

آخری یعنی حصۂ ہشتم میں قرآنی نقطۂ نظر سے امت کی تاریخ پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے تاکہ بقول فاضل مؤلف: "امت کو معلوم ہو جائے کہ آج جن جن مصائب و آلام میں وہ گرفتار ہے وہ اس کی کن کن غلط کاریوں اور قرآن کی مخالفتوں کے نتائج ہیں۔" (صفحہ ۵) نیز اس حصے میں مسلمانوں کے مذہبی اور سیاسی فرقوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کا یہ پورا سلسلہ دراصل مولانا کی زندگی کا بہت بڑا اور عظیم الشان علمی کارنامہ ہے۔

عبداللطیف اعظمی

حیاتِ اسلم کی اہم تاریخیں

۱۸۸۲

۲۷ جنوری (۷ ربیع الاول ۱۲۹۹ھ) کو جمعہ کے دن، اعظم گڈھ (یوپی) کے ایک گاؤں بجراجپور میں پیدا ہوئے۔

۱۸۸۷

پانچ سال کی عمر میں مکتب کی تعلیم کا آغاز ہوا، سال بھر میں قاعدہ اور تین پارے ختم کر لئے۔

۱۸۸۸

اپنے والد، مولانا سلامت اللہ صاحب کے ساتھ جو ریاست بھوپال میں واعظِ شہر تھے، بھوپال تشریف لے گئے اور وہاں حفظِ قرآن شروع کیا۔

۱۸۹۰

دو سال کی مدّت میں حفظ قرآن ختم کر لیا اور ۹ سال کی عمر میں ۱۳۰۷ھ میں پہلی محراب سنائی، اسی سال گھر پر فارسی کی تعلیم شروع ہوئی، یہ سلسلہ ۳ سال میں ختم ہوا، اس کے بعد حساب، اقلیدس، مساحت اور جبر و مقابلہ، بھوپال کے مشہور ریاضی داں مولوی شاہ محمد صاحب سے پڑھا، ریاضی کے بعد انگریزی کی تعلیم شروع ہوئی۔ ساتھ ہی صرف و نحو، فقہ و اصول فقہ، منطق و فلسفہ، ادب، حدیث اور قرآن کی تعلیم بھی ترتیب وار شروع ہوئی، ان میں بیشتر مضامین ان کے والد مولانا سلامت اللہ صاحب خود پڑھاتے تھے۔

۱۹۰۳

تعلیم سے فراغت کے بعد لاہور گئے اور "پیسہ اخبار" میں مترجم کی حیثیت سے کام شروع کیا۔

۱۹۰۴

۴ر جون (۳۱ر ربیع الاول ۱۳۲۲ھ) کو بھوپال میں ان کے والد، مولانا سلامت اللہ صاحب کا تقریباً ۵۴ سال کی عمر میں انتقال ہوا اور وہیں ریاست میں دفن ہوئے۔

۱۹۰۶

علی گڑھ کالجیٹ اسکول میں عربی و فارسی کے استاد کی حیثیت سے تقرر ہوا۔

۱۹۰۷

مولانا کی پہلی کتاب "تاریخ القرآن" علی گڑھ مدرستہ العلوم سے شائع ہوئی۔

۱۹۰۸

خواجہ حافظ شیرازی کی سوانح حیات لکھی جو "حیات حافظ" کے نام سے علی گڑھ مدرستہ العلوم سے شائع ہوئی۔

۱۰-۱۹۰۹

صوبہ متحدہ و آگرہ کی ایڈمنسٹریشن رپورٹ میں "تاریخ القرآن" اور "حیات حافظ" کو اس سال کی اردو مطبوعات میں سب سے بہترین قرار دیا گیا۔

۱۹۱۱

مولانا کی تیسری کتاب "حیاتِ جامی" شائع ہوئی۔

۱۹۱۲

علی گڑھ مدرستہ العلوم کی لٹن لائبریری میں مشرقی کتب کے شعبے کے انچارج مقرر ہوئے اور اس کی فہرست مرتب کی، کچھ عرصے کے بعد مدرستہ العلوم میں عربی و فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے

۱۹۱۷

ریاست بھوپال گئے اور اپنے والد کی قبر کے آس پاس گندگی دیکھ کر فارسی میں ایک نظم

لکھی اور والیۂ بھوپال کی خدمت میں پیش کی جس میں قبر کی حالت بیان کی تھی، حسب توقع صفائی کا حکم صادر ہوا اور آیندہ کے لئے انتظام کر دیا گیا

۱۹۱۸

دار المصنفین اعظم گڈھ کے رسالہ "معارف" میں مولانا کا مضمون: محجوب الارث یعنی یتیم پوتوں کی وراثت کا مسئلہ دو قسطوں میں جولائی اور اگست کے شماروں میں شائع ہوا، شروع میں رسالے کی طرف سے ایک نوٹ لکھا گیا تھا کہ: "اس مضمون کی تحقیق پر علمائے فرائض میں سے کوئی بزرگ سنجیدگی اور دلائل کے ساتھ لکھیں گے تو ہم شکریے کے ساتھ شائع کریں گے۔" (صفحہ ۲۵)
اسی موضوع پر مولانا نے ایک مختصر کتاب: "الوراثۃ فی الاسلام" کے نام سے عربی میں لکھی جو غالباً اسی سال علی گڑھ سے شائع ہوئی۔

۱۹۱۹

ماہنامہ "معارف" (اعظم گڈھ) کے جولائی کے شمارے میں "حلاوتِ علم" کے عنوان سے ۴ بند اور ۳۲ اشعار کی ایک طویل نظم شائع ہوئی (صفحات ۵۷ - ۷۶)

۱۹۲۰

اواخر دسمبر ۱۹۱۹ء میں مولانا محمد علی نظر بندی اور قید سے رہا ہوئے اور ۲۴ جنوری (۱۹۲۰ء) کو مدرسۃ العلوم تشریف لے گئے تو کالج کی طرف سے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا، اس موقع پر مولانا نے "ہدیۂ خلوص" کے نام سے ایک نظم لکھی اور جلسے میں پڑھ کر سنائی۔
اسی سال جب ۲۹ اکتوبر کو مہاتما گاندھی، مولانا محمد علیؒ اور دوسرے قومی رہناؤں کی کوششوں سے علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم ہوئی اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے خطبے سے اس کا افتتاح ہوا تو مولانا محمد علی کی خواہش پر مدرسۃ العلوم کو چھوڑ کر جامعہ چلے آئے اور تاحیات اس کی خدمت کی۔

۱۹۲۳

جنوری میں علی گڑھ سے ماہنامہ "جامعہ" پہلی مرتبہ شائع ہوا تو اس میں تاریخ الامت کے حصہ اول (سیرت الرسول) اور حصہ دوم (خلافت راشدہ) کا اشتہار شائع ہوا۔ اس

کتاب کے بارے میں مولانا نے اپنے خود نوشت حالات (میری طالب العلمی) میں لکھا ہے کہ: "علی گڑھ کالج ہی میں میں نے تاریخ الامت لکھنے کا سلسلہ شروع کیا تھا لیکن اس کی اشاعت اس وقت ہوئی جب میں جامعہ ملیہ میں آگیا۔" فروری کے شمارے میں مولانا کا مضمون "کتب خانہ جامعہ"، مارچ کی اشاعت میں تاریخ الامت کے تیسرے حصے (خلافت بنی امیہ) کا اشتہار، جولائی میں مولانا کی عربی کتاب "الوراثۃ فی الاسلام" پر تبصرہ، ستمبر میں علامہ اقبال کی کتاب: "پیامِ مشرق" پر مولانا کا تبصرہ اور مولانا کی نظم "نویدِ امید"، اکتوبر میں مولانا کا مضمون "قسطنطنیہ کا تعلق اسلام کے ساتھ" اور مولانا کی نظم "جزیرۃ العرب" شائع ہوئی۔

۱۹۲۴

جنوری کے جامعہ میں مولانا کا ایک مضمون "سیلِ تاتار" کے عنوان سے شائع ہوا اور فروری کے شمارے میں ایک غزل شائع ہوئی جس کے شروع میں مدیر کا ایک نوٹ ہے: "مولانا کی یہ غزلِ مسلسل صرف بادۂ شاعری ہی نہیں ہے بلکہ خمارِ چشمِ ساقی کا کیف بھی اس میں شامل معلوم ہوتا ہے۔" اس کا مطلع اور مقطع ملاحظہ ہو:

غرورِ حسن و نازِ دلبری دیکھ　　تماشائے بتانِ آذری دیکھ
نہیں یہ داستانِ قیس و فرہاد　　مرا قصہ۔ نہ اسلم سرسری دیکھ

مارچ کے جامعہ میں مولانا کا مضمون "مسئلۂ خلافت" شائع ہوا جس میں خلافت کے منصب کو ختم کر دینے پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے فاضل مضمون نگار نے لکھا: "ترکوں نے جب اپنی جمہوریہ قائم کر لی تو ہر ایک مسلمان کو یہ توقع ہوگئی تھی کہ اب وہ مسئلہ خلافت کا صحیح حل نکالیں گے اور اس کو بہترین شکل میں قائم کریں گے۔"

جولائی اور اگست کے مشترک شمارے پر مولانا کا نام مدیر کی حیثیت سے شائع ہوا۔ اور ایک طویل عرصے تک اعزازی طور پر یہ خدمت انجام دیتے رہے۔

اگست یا ستمبر میں حکومت کابل نے محکمۂ شرعیہ کے فیصلے پر ایک شخص کو محض اس لیے سنگ سار کر دیا کہ وہ قادیانی تھا، مولانا نے ستمبر کے شذرات میں اختصار کے ساتھ اس پر اظہارِ خیال کیا اور اکتوبر کے شمارے میں "قتلِ مرتد" کے عنوان سے ایک مضمون شائع

کیا جس میں تفصیل سے قرآن و حدیث کی روشنی میں اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے لکھا کہ حکومت کابل کا یہ اقدام نامناسب اور اسلامی شریعت کے منافی تھا۔

۱۹۲۵

جامعہ ملیہ علی گڑھ سے دہلی (قرول باغ) منتقل ہوئی اور جولائی سے نیا تعلیمی سال قرول باغ (دہلی) میں شروع ہوا، دوسرے اساتذۂ جامعہ کے ساتھ مولانا بھی دہلی آ گئے۔ جامعہ کی پانچویں سالگرہ کے موقع پر ۲۹ر اکتوبر کو ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس میں مولانا نے بھی اپنا کلام سنایا۔

۱۹۲۶

فروری میں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب یورپ سے تشریف لائے اور جامعہ میں کام شروع کیا، ان تینوں بزرگوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے، فروری کے شذرات میں مولانا نے لکھا: "قیام یورپ کے زمانے میں ان حضرات کے جو خطوط آتے رہتے ان سے نہ صرف ان کے بلند حوصلوں اور ارادوں کا پتہ چلتا تھا بلکہ ان سے افسردہ دلوں کو ڈھارس بھی بندھتی تھی اور وہ لوگ بھی جو جامعہ کے قیام سے ناامید ہو چکے تھے یہ سن کر کہ یہ تینوں حضرات اپنی خدمات جامعہ کے لئے پیش کر رہے ہیں، خاموش ہو جاتے تھے۔" ماہنامہ جامعہ کی ادارت میں عابد صاحب کا بھی اضافہ ہوا تھا اس لیے ان کا خیر مقدم کرتے ہوتے مولانا نے لکھا: "موصوف کا نام نامی "جامعہ" کے ناظرین کے لئے تعارف کا محتاج نہیں، آپ کے مضامین اور نظمیں متعدد مرتبہ ہمارے رسالے میں شائع ہو چکی ہیں اور ان کا اعلیٰ معیار ہمارے ناظرین پر پوشیدہ نہ ہوگا۔" (صفحہ ۱۲۸)

اسی سال اپریل میں مولانا کی اہلیہ کا انتقال ہوا، چنانچہ اس ماہ کے شذرات میں ایک تعزیتی نوٹ شائع ہوا اور مولانا کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتے ہوئے لکھا گیا: "ہمارے رسالے کے مدیر اور جامعہ ملیہ کے استاد تاریخ اسلام مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری کو اس مہینے میں صدمۂ جانکاہ برداشت کرنا پڑا۔"

۱۹۲۸

۲۸ر اپریل کو مولانا بغرض حج بمبئی پہنچے، ان کے ساتھ ایک رفیق کار مولانا خواجہ عبدالحیٔ بھی

تھے، بمبئی پہنچ کر انھیں معلوم ہوا کہ ایک وفد سعودی حکومت کی خدمت میں جارہا ہے، جس میں مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا عبدالواحد غزنوی، مولوی داؤد غزنوی اور مولوی اسمٰعیل غزنوی شامل ہیں۔ ان اراکین نے اس وفد میں مولانا اور خواجہ صاحب کو بھی شامل کر لیا۔ ۸ رمئی کو یہ وفد بمبئی سے حجاز کے لئے روانہ ہوا اور جب جدہ پہنچا تو ان کا شاہی استقبال کیا گیا اور سلطان ابن سعود نے اسے شرفِ ملاقات بخشا، مکہ معظمہ پہنچنے پر مولانا ظفر علی خاں بھی اس وفد میں شریک ہو گئے، ظفر علی خاں نے سلطان کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے ایک نظم کہی تھی جس کا مولانا نے عربی میں ترجمہ کر دیا اور عربی میں ایک تمہید بھی لکھدی جنھیں ظفر علی خاں نے اردو نظم سنانے کے بعد یہ ترجمہ اور تمہید بھی پڑھکر سنائی۔

مولانا اور ظفر علی خاں حقہ پینے کے عادی تھے اس لیے باوجود اس کے کہ مکہ معظمہ میں تمباکو نوشی بالعموم ممنوع تھی مگر پھر بھی ان دونوں بزرگوں نے حقہ نوشی کا شغل جاری رکھا۔ ایک روز کوئی ملازم نہیں تھا اس لیے ظفر علی خاں نے چلم سنبھالی اور مولانا نے حقہ تازہ کیا، اس پر ظفر علی خاں نے حسب ذیل شعر برجستہ کہے :

بھرتے ہیں چلم ظفر علی خاں	اسلم کرتے ہیں حقہ تازہ
مکہ میں جب آ گئی یہ نوبت	حقے کا نکالدو جنازہ

مولانا نے لکھا ہے : "جنازہ تو نہیں نکالا گیا، ہاں یہ ہوا کہ ہمارا حقہ حج میں ساتھ نہیں گیا" حج کے بعد ۴ رجون کو مولانا مکہ سے روانہ ہوئے، ۸ روز جدہ میں ٹھہر کر، ۱۲ رجون کو وہاں سے روانہ ہوئے اور ۲۲ رجون کو بمبئی پہنچے۔

پہلے امیر جامعہ حکیم اجمل خاں کے انتقال کے بعد، جامعہ ملیہ کی مالی حالت بہت خراب ہو گئی تو شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے ۹ رجولائی کو دوسرے امیر جامعہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کو اس طرف توجہ دلائی اور انجمن تعلیم ملی قائم کی جس کے اراکین نے یہ عہد کیا کہ وہ کم سے کم ۲۰ سال یا تا حیات جامعہ کی خدمت کریں گے اور ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار سے زیادہ تنخواہ نہ لیں گے، سب سے پہلے جن لوگوں نے یہ عہد لیا ان میں مولانا اسلم صاحب بھی شامل تھے۔ ۳۰ رستمبر کو جامعہ ملیہ میں انجمن تعلیم ملی کا ایک جلسہ منعقد ہوا اور شیخ الجامعہ

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی تحریک اور حافظ فیاض احمد صاحب کی تائید پر مولانا اس کے صدر منتخب ہوئے، جلسے نے انجمن کے لیے دستور اساسی منظور کیا۔ اسی جلسے میں پہلی مجلس انتظامیہ کا انتخاب ہوا جو عہدہ داروں کے علاوہ چار اراکین پر مشتمل تھی، اس کے ایک رکن مولانا بھی تھے۔

۱۹۳۰

نومبر کے جامعہ میں مولانا کا مضمون "وضع حدیث" شائع ہوا جو نزاع کا باعث ہوا۔

۱۹۳۱

اگست کے جامعہ میں مولانا کے مضمون: "وضع حدیث" کے جواب میں جامعہ کے ایک طالب علم رئیس احمد صاحب جعفری ندوی کا مضمون شائع ہوا۔ ستمبر کے جامعہ میں مولانا کا ایک اور مضمون: "منکرین حدیث" شائع ہوا، رئیس احمد جعفری صاحب نے اس کا جواب بھی لکھا جو اکتوبر کے جامعہ میں "انکار حدیث" کے عنوان سے شائع ہوا۔ ستمبر ہی کے شمارے میں مولانا کی ایک نظم "طالب العلم کی دعا" شائع ہوئی جس کا پہلا اور آخری شعر حسب ذیل ہیں:

محبت سے تری یارب یہ دل معمور ہو جائے
سراسر ہے یہ تاریکی، سراسر نور ہو جائے
تمنائے دلی یارب دعا بن کر نکلتی ہے
عجب کیا ہے، تری درگاہ میں منظور ہو جائے

۱۹۳۲

فروری کے جامعہ میں مولانا کی ایک غزل شائع ہوئی جس کا مطلع اور مقطع ملاحظہ ہوں:

خود سراپا ناز کہہ لوں اس ستم آرا کو میں
کس طرح قائل کروں گا لیکن اک دنیا کو میں
کاش ہو اس کے قدم تک بھی رسائی ایک دن
چومتا رہتا ہوں اسلم جس کے نقشِ پا کو میں

۹ اپریل کو ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب کی صدارت میں جامعہ کی اردو اکادمی کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں مولانا نے ایک مضمون: "مصر کی قدیم تہذیب پر اسلام کا اثر" پڑھا جو اپریل اور مئی کے جامعہ میں شائع ہوا۔ ۲۶ نومبر کو مولانا کی صدارت میں اردو اکادمی کا ایک اور جلسہ منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب نے "عقیدۂ اعجاز قرآن کی تاریخ" پڑھا۔

۱۹۳۵

یکم مارچ کو دلی شہر سے ۱۰-۱۲ کیلومیٹر دور اوکھلا کے پاس جامعہ کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا، اس موقع پر مولانا نے ایک روح پرور نظم پڑھ کر سنائی جس کا حسب ذیل شعر بہت مقبول اور مشہور ہوا:

عشرتِ شاہی میں بھی حاصل نہیں پرویز کو
وہ مزا جو کوہکن کی سعی بے حاصل میں ہے

۱۹۳۸

ماہنامہ "طلوع اسلام" (دہلی) کے مئی کے شمارے میں مولانا کا مضمون: "فہم قرآن"، جون میں "اصول قرآن"، اکتوبر میں "اسلامی نظام" کے عنوانات سے مضامین اور "امام" کے عنوان سے ایک نظم شائع ہوئی۔ جس کا پہلا اور آخری شعر حسب ذیل ہیں:

عروج پا نہیں سکتی جہاں میں وہ ملت
کہ جس کا کوئی نہ مرکز ہو اور نہ کوئی امام
اگر ہے دینِ محمدؐ کا پاس امت کو
تو آج نصبِ امامت ہے اس کا پہلا کام

۱۹۳۹

جنوری کے "طلوع اسلام" میں مولانا کی نظم: "لامرکزیت" شائع ہوئی جو اس شمارے میں شائع ہو رہی ہے۔

۱۹۴۰

امسال جامعہ کے بیشتر ادارے اپنی مستقل آبادی جامعہ نگر میں منتقل ہو گئے اور نیا

تعلیمی سال یہیں شروع ہوا، چونکہ یہاں عمارتوں کی بہت کمی تھی، اس لیے بہت سے اساتذہ نے نئے اپنے لیے مکان بنوا لیئے تھے، ان میں مولانا بھی شامل تھے۔ مولانا نے طلبائے کالج کی یونین "انجمن اتحاد" میں "اسلام کا آخری رکن" کے عنوان سے مضمون پڑھا۔

۱۹۴۴

۲۲ مارچ کو مدرسہ ثانوی کے اہتمام میں یوم حالی منایا گیا جس میں بہت سے بیرونی مشاہیر نے شرکت کی۔ مولانا نے اس جلسے کی صدارت فرمائی۔

۱۹۴۵

اس سال ۲۹ اکتوبر کو جامعہ ملیہ کے قیام کو ۲۵ سال ہونے والے تھے، اس لئے جشن سیمیں منانے کا فیصلہ کیا گیا اور اس کی تیاری کے لیے جناب عبدالغفار صاحب مدہولی کی ادارت میں مارچ سے ایک قلمی سا "صحیفہ جوبلی" نکلنے لگا جس کے لیے مدہولی صاحب کی درخواست پر منجملہ اور اساتذہ کے مولانا نے حسب ذیل پیغام بھیجا:

"میں جامعہ کے کارکنوں، بزرگوں اور عزیزوں سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ اللہ کی اس عظیم الشان نعمت یعنی اخلاص کی قدر کریں، باہمی رواداری اور ہمدردی سے جس طرح آج تک ہم نے اپنے اجتماعی مقصد کو سامنے رکھا ہے اور متفق ہوکر اس کی طرف قدم بڑھاتے رہے ہیں، اسی طرح آئندہ بھی اتفاق اور اتحاد ہی کے ساتھ کام کریں گے، کیونکہ آسمانی امداد اور انسانی کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ یہی ہے۔"

۱۹۴۶

۱۷ نومبر کو جوبلی کے موقع پر مولانا کی صدارت میں ایک کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا جس میں برصغیر کے مشہور شعراء نے شرکت کی۔

۱۹۴۷

جامعہ کا تعلیمی سال وسط جولائی سے شروع ہوتا تھا، مگر اس سال دہلی کے حالات پرسکون نہیں تھے اس لیے جامعہ کافی تاخیر سے کھلی، اس لئے وسط اکتوبر میں مولانا دوست احباب سے ملنے کے لئے کلکتہ سے ہوکر لاہور تشریف لے گئے اور تقریباً ۲۰ - ۲۵ روز قیام کر کے واپس آ گئے مولانا بیان کرتے تھے کہ ان کے شاگردوں اور عقیدت مندوں کا بڑا اصرار تھا کہ وہ وہیں رک جائیں، انھیں دینیات کی پروفیسر شپ اور صدارت بھی پیش کی گئی، مگر مرحوم نے شکریے

کے ساتھ اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

۱۹۵۶ء

موسم گرما کی تعطیل وطن میں گذارنے کے بعد مولانا جامعہ ملیہ واپس آئے تو ستمبر میں بیمار پڑ گئے، نفس، بلڈ پریشر اور کچھ دل کی تکلیف تھی، وسط اکتوبر میں دل کا دورہ پڑا، مگر اواخر اکتوبر سے بتدریج صحت بہتر ہونے لگی، البتہ کمزوری باقی تھی اور چلنے پھرنے کی اجازت نہیں تھی، یہی کیفیت اواخر دسمبر تک باقی رہی، بالآخر ۲۸ر دسمبر (۱۳ر جمادی الاول ۱۳۷۵ھ) کو بدھ کے دن تقریباً ۲ بجے دن کو دل کا دوسرا دورہ پڑا اور وہ اپنے مالک حقیقی کے پاس پہنچ گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

مولانا کی وفات کی خبر کو مختلف اخبارات نے نمایاں کر کے شائع کیا اور موقر رسالوں نے تعزیتی شذرات لکھے۔ اردو کے مشہور قوم پرور سہ روزہ اخبار "مدینہ" (بجنور) نے اپنی ۵ر جنوری (۱۹۵۶ء) کی اشاعت میں صفحۂ اول پر اس خبر کو جگہ دی، اس نے نئی دہلی کی ۳۱ر دسمبر کی خبر کے حوالے سے لکھا: "گذشتہ منگل [بدھ] کو دو بجے مولانا اسلم جیراجپوری کا حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال ہو گیا۔ مولانا کا جامعہ ملیہ کی بہت ہی بزرگ ہستیوں میں شمار ہوتا تھا۔"

اردو کے ممتاز ماہنامہ اور دار المصنفین (اعظم گڈھ) کے ترجمان "معارف" کے شذرات میں، اس کے مدیر شہیر مولانا شاہ معین الدین صاحب ندوی نے لکھا: "مولوی اقبال احمد خاں صاحب سُہیل کی وفات کا حادثہ ابھی تازہ تھا کہ اعظم گڈھ کی ایک اور نامور شخصیت اٹھ گئی اور ملک کے مشہور مصنف اور صاحبِ قلم مولانا اسلم صاحب جیراجپوری نے ۲۸ر دسمبر کو انتقال کیا۔ ان کا وطن، اعظم گڈھ کا مشہور گاؤں جیراجپور تھا، ان کے والد مولانا سلامت اللہ صاحب جماعت اہل حدیث کے ممتاز علماء میں تھے، نواب صدیق حسن خاں نے بھوپال میں جن علماء کو جمع کیا تھا ان میں ایک مولانا سلامت اللہ صاحب بھی تھے۔ وہ بھوپال کے عربی مدارس کے مہتمم تھے، اس لئے مولانا اسلم صاحب کی تعلیم و تربیت وہیں ہوئی۔ تکمیل تعلیم کے بعد وہ "پیسہ اخبار" لاہور کے عملۂ ادارت میں شامل ہو گئے، پھر علی گڈھ کالجیٹ

اسکول میں عربی کے مدرس مقرر ہوئے، کچھ دنوں تک لٹن لائبریری کے شعبۂ مشرقیات کے نگراں رہے اور عربی فارسی کتابوں کی فہرست مرتب کی، اس کے بعد علی گڑھ کالج[1] میں لکچرار ہو گئے، پھر جامعہ ملیہ کے قیام کے بعد علی گڑھ کالج[2] سے قطع تعلق کر کے جامعہ ملیہ چلے آئے اور تاریخ اسلام کے پروفیسر مقرر ہوئے اور آخر عمر تک جامعہ سے وابستہ رہے اور بالآخر اسی کی خاک کا پیوند ہوئے۔

مرحوم صاحب علم و نظر عالم تھے۔ اگرچہ ان کی تعلیم پر انے اور کچھ اہلحدیث کے ماحول میں ہوئی تھی لیکن وہ بڑے روشن خیال اور زمانے کے حالات و رجحانات سے باخبر تھے اور کسی سوسائٹی میں اجنبی نہیں معلوم ہوتے تھے، تالیف و تصنیف کا ذوق ابتدا سے تھا۔ اسلامی تاریخ پر تاریخ الامت، سوانح عمرو بن العاص، تاریخ نجد، حیاتِ حافظ اور حیاتِ جامی وغیرہ بہت سی کتابیں لکھیں، ان میں تاریخ الامت زیادہ مقبول ہوئی ـــــ ان کے مضامین کا ایک مجموعہ "نوادرات" کے نام سے چند سال ہوئے ادارۂ طلوع اسلام کراچی سے شائع ہوا ہے۔ شعر و ادب کا بھی ستھرا مذاق رکھتے تھے اور بڑی شگفتہ اردو لکھتے تھے، کبھی کبھی قومی و ملّی اور تاریخی نظمیں بھی لکھتے تھے،... مسلکاً اہلِ قرآن کی طرف مائل تھے مگر منکرین حدیث کی طرح غالی نہ تھے اور سنت متواترہ کو مانتے تھے، عملاً دیندار اور طبعاً بڑے سادہ، متواضع اور خلیق تھے۔" (جنوری ۱۹۵۶ء)

"کتابی دنیا" (کراچی) کے ایڈیٹر جناب ضیاء الدین احمد برنی نے مولانا کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا: "مرحوم اپنے دور کے ممتاز ترین علماء میں سے تھے، قرآن کریم پر ان کی حکیمانہ نظر تھی، انھوں نے اپنی ساری عمر کتابوں میں گذار دی اور زندگی بھر

[1،2] ان دونوں جگہوں پر فاضل مدیر نے سہواً مسلم یونیورسٹی لکھا ہے، مسلم یونیورسٹی بہت بعد میں قائم ہوئی۔ (ادارہ)

طالب علم رہے ، ان میں ابوذر کا سا فقر و ایثار تھا اور وہ اسی راستے پر ساری عمر گامزن رہے ، ساری عمر کھدر پہنا اور وہ بھی موٹی قسم کا جسے عام اصطلاح میں گاڑھا کہتے ہیں ، وہ انگریزی کی مثل : "سادہ زندگی ، بلند خیال" کے پیکر تھے ، مزاج میں سادگی و شیفگی انتہا کی تھی ، وہ نام و نمود سے دور رہتے تھے ان کی کتاب "تعلیمات قرآن" عجیب و غریب کتاب ہے اور اس میں اصول و عقائد اسلام کی ایسی شرح ہے جو کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتی ، تاریخ الامت بھی ان کی لاجواب تاریخ ہے اور مردوں اور عورتوں سب کے پڑھنے کی چیز ہے۔ ان کے دل میں دنیا بھر کے مسلمانوں کا درد تھا ، دنیا ایک عالم با عمل سے خالی ہو گئی جو اپنی ذات سے فرد نہیں انجمن تھے ، خدا ان کی تربت پر رحمتوں کی بارش کرے ۔"

" (فروری ۱۹۵۷ ص ۳)

میں یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ مولانا کی وفات پر مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی نے کن تاثرات کا اظہار کیا ہے ، مگر مجھے مایوسی ہوئی ، اُس زمانے کے "صدق جدید" کے متعدد شمارے دیکھ ڈالے لیکن وفات کی خبر تک نظر نہ آئی ۔ یہ صحیح ہے کہ کہ مولانائے مرحوم کے بعض مذہبی خیالات سے مولانا دریا آبادی صاحب کو اختلاف تھا لیکن اگر وہ قاضی عبدالغفار صاحب کی وفات پر جن کا انتقال ۱۷ جنوری ۱۹۵۷ء کو ہوا تھا ، "صدق جدید" کے ۲۷ جنوری کے شمارے میں تعزیتی نوٹ شائع کر سکتے ہیں ، تو مولانا اسلم صاحب کے لیے کم از کم دعائے مغفرت تو کر ہی سکتے تھے ۔